QURAN COLLEGE OF ARTS & SCIENCE

Registered & Recognised by the BISE Lahore

دنیوی اور دینی تعلیم کا حسین امتزاج

قرآن کالج آف آرٹس اینڈ سائنس

نگران و سرپرست : ڈاکٹر اسرار احمد

Classes:

- **FA** (Arts Group)
- **FA** (General Science)
- **I.Com** (Banking/Computer)
- **ICS** (Math+Stat+Computer Science)
- **ICS** (Math+Physics+Computer Science)
- **BA** (Ecomomics+Maths)
- **BA** (Other Combination)

- ایک مکمل تعلیمی و تربیتی پروگرام
- بنیادی دینی تعلیم کا خصوصی اہتمام
- بورڈ اور یونیورسٹی کے نصاب تعلیم کی معیاری تدریس
- آڈیو اور ویڈیو سہولتوں سے آراستہ
- لاہور کے خوبصورت اور پرسکون علاقے میں شاندار عمارت
- انتہائی محنتی اور قابل اساتذہ
- ہم نصابی سرگرمیوں میں تحریر و تقریر پر خصوصی توجہ
- مثالی نظم و ضبط
- وسیع و عریض، قابل دید، ایئر کنڈیشنڈ آڈیٹوریم
- ہاسٹل کی محدود سہولت، فرنشڈ کمرے
- کمپیوٹر ایپلیکیشنز میں Office 2000 کی لازمی اور مفت تعلیم

مزید تفصیلات کے لئے درج ذیل پتے سے پراسپکٹس طلب کیجئے

قرآن کالج ۱۹۱ اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور ☎ : 5833637

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: حافظ خالد محمود خضر، پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

جلد ۲۲ | ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ - جون ۲۰۰۳ء | شمارہ ۶

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶- کے- ماڈل ٹاؤن- لاہور ۱۴- فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: داؤد منزل متصل شاہ بخاری- شاہراہِ لیاقت کراچی فون: ۲۱۹۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون: 100 روپے، فی شمارہ: 10 روپے

☆ ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 700 روپے ☆ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 900 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

حرفِ اوّل

رجوع الی القرآن کورس کی تکمیل کرنے والے ایک شریک انجینئر محمد اکرم کے تاثرات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام بنیادی دینی تعلیم پر مشتمل ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس بحمد اللہ برس ہا برس سے نہایت پابندی اور تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ کورس کا آغاز اوائل ستمبر سے ہوتا ہے اور تکمیل اواخر مئی میں ہوتی ہے ـــــ یہ کورس بنیادی طور پر ان افراد کے لئے ترتیب دیا گیا ہے جو کم و بیش گریجوایشن کی سطح تک اپنی مروّجہ دنیاوی تعلیم مکمل کرنے کے بعد قرآن فہمی کی غرض سے بنیادی دینی علوم کی تحصیل کے لئے نو دس ماہ فارغ کرنے کے لئے تیار ہوں ـــــ بحمد اللہ ہر سال اوسطاً بیس بائیس افراد اس کورس کو مکمل کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر کسی نہ کسی درجہ میں قرآن کے پرچارک بن جاتے ہیں۔ کورس کے شرکاء میں عموماً بیس سے لے کر ساٹھ سال تک کی عمر کے لوگ اور ایف اے اور بی اے ہی نہیں ایم اے اور پی ایچ ڈی لیول کے افراد شریک ہوتے ہیں جن میں ایک قابل ذکر تعداد انجینئرز، ڈاکٹرز اور دیگر پروفیشنلز کی بھی ہوتی ہے۔ حال ہی میں جس گروپ نے اس کورس کی تکمیل کی ہے اس میں ۲۴ مرد حضرات کے ساتھ ساتھ دس خواتین بھی شامل تھیں ـــــ واضح رہے کہ خواتین اس کورس میں ''من وراء حجاب'' تعلیم حاصل کرتی ہیں۔

اس سال کورس کی تکمیل ۳۱ مئی کو ہوئی اور یکم جون کو بروز اتوار قرآن آڈیٹوریم میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ کے ہفتہ وار درس قرآن کے بعد تقسیم اسناد کی ایک باوقار تقریب منعقد ہوئی۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے کورس کے شرکاء میں اسناد تقسیم کیں ـــــ کورس میں اوّل، دوم اور سوم پوزیشن حاصل کرنے والوں نے اپنے تاثرات بھی بیان کئے ـــــ کورس کے ایک سینئر شریک انجینئر محمد اکرم صاحب نے جو پاکستان ریلوے میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز رہنے کے بعد ریٹائرمنٹ ملنے پر کورس میں شریک ہوئے تھے اور تیسری پوزیشن حاصل کی تھی، اپنے جو احساسات و تاثرات بیان کئے وہ بلاشبہ غیر معمولی تھے۔ ذیل میں موصوف کی تاثرات پر مبنی خوبصورت تحریر ہدیہ قارئین کی جا رہی ہے:

'' چند برس پہلے کی بات ہے، میرے ایک رفیق کار نے ''تنظیم اسلامی'' میں شمولیت اختیار کی۔ حج پر چلے گئے پھر رجوع الی القرآن کورس کیا، جس کے نتیجے میں وہ بالکل بدل چکے تھے۔ اب اسلامی شعار کے پیکر جی ایم سومرو کی طرزِ زندگی اسلامی مجاہد کی سی تھی۔ میرا دل بھی چاہنے لگا کہ غلام محمد بنا جائے لیکن غم روزگار نے اس جذبے کو متحرک نہ ہونے دیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جب میں نقل مکانی کر کے ماڈل ٹاؤن کے ڈی بلاک میں رہائش پذیر ہوا تو اندر سے سوال اٹھتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے قرآن اکیڈمی کے قریب رہائش کیوں دی ہے۔ سوال کرنے والا جواب بھی خود ہی دیتا رہتا کہ تو خود ہی غلام محمد بننا چاہتا تھا، اب وقت آ گیا ہے، بن جا۔ اسی دوران ایک اور حملہ ہوا۔ بہت اچھے پیکج والی ملازمت بالکل قریب نظر آنے لگی۔ دل بھی اسی طرف مائل ہونے لگا لیکن اس دفعہ دل یا شکم میں سے دل والا معاملہ قدرے غالب لگتا

(باقی صفحہ ۶۵ پر)

وحدتِ ادیان کا باطل تصور

سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۲ کی آڑ میں

ڈاکٹر اسرار احمد

تمہید

قرآن حکیم کے بالکل آغاز میں مکی اور مدنی سورتوں کا جو پہلا گروپ ہے اس میں مکی سورت صرف سورۃ الفاتحہ ہے' جو اگرچہ قامت میں تو بہت مختصر ہے لیکن قیمت میں بہت گراں قدر ہے۔ اس کے بعد چار سورتیں مدنی ہیں' ان میں پہلی سورۃ البقرۃ ہے جو قرآن حکیم کی طویل ترین سورتوں میں سے ایک ہے۔ اس میں دو مضامین کی لڑیاں تسلسل کے ساتھ چلتی ہیں۔ ایک تو اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ دونوں پر اتمامِ حجت ـــــ اس لئے کہ مکی قرآن میں اصل مخاطب مشرکین عرب تھے اور ان پر دعوت کا حق ادا کر کے ہر طرح سے اتمامِ حجت ہو چکا تھا۔ اگرچہ مکی دَور کے آخری حصہ میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں اہل کتاب کی طرف بھی حوالہ تھا' چنانچہ سورۃ الاعراف میں نمایاں طور پر روئے سخن اہل کتاب کی طرف ہے' لیکن ان سے اصل خطاب نبی اکرم ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے بعد شروع ہوا ہے۔ لہٰذا ان چار سورتوں (البقرۃ تا المائدۃ) کا مسلسل ایک مضمون ہے' یعنی اہل کتاب کو دعوت' ان پر اتمامِ حجت اور ساتھ ہی ملامت۔ اللہ کے دین اور اس کی عطا کردہ نعمت کے ساتھ ان کا جو طرزِ عمل رہا' اس کی بنا پر ان پر فردِ جرم عائد کی گئی ہے۔

سورۃ البقرۃ میں جو دوسرا مضمون تسلسل کے ساتھ چلتا ہے' جس کا نقطۂ آغاز سورۃ البقرۃ اور نقطۂ عروج سورۃ المائدۃ ہے' وہ شریعت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے۔ مکی سورتوں میں ایمان کے مضامین بیان ہوئے ہیں یا پھر انبیاء و رُسل کے حالات جو

بہت ہی تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ ان میں بنیادی انسانی اخلاقیات کا مضمون بھی آیا ہے' لیکن شرعی احکامات اصلاً مدینہ منورہ ہی میں آئے ہیں جہاں ان کی تنفیذ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ سے ان کا آغاز ہوا اور سورۃ المائدۃ میں تکمیل ہوئی۔

اب سورۃ البقرۃ جو ہمارے زیرِ مطالعہ ہے' اس کے بارے میں چند باتیں نوٹ کر لیں۔ ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے ہجرت کے بعد نازل ہونے والی یہ پہلی سورۃ ہے' اگرچہ اس کا نزول اس طور سے نہیں ہوا ہے کہ پوری سورۃ ایک بار نازل ہو گئی ہو۔ حجم کے لحاظ سے یہ قرآن مجید کی عظیم ترین سورۃ ہے اور اس کی عظمت صرف حجم کے لحاظ سے ہی نہیں' بعض دیگر اعتبارات سے بھی ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ ؓ نے حضور نبی اکرم ﷺ کا فرمانِ مبارک نقل کیا ہے' جسے جامع ترمذی میں روایت کیا گیا ہے کہ ''ہر شے کی ایک چوٹی ہوتی ہے اور قرآن حکیم کی چوٹی سورۃ البقرۃ ہے''۔ یہ سورۃ مبارکہ وقفے وقفے سے تھوڑی تھوڑی آیات کی شکل میں ہجرت کے بعد سے لے کر غزوۂ بدر کے متصلاً قبل تک نازل ہوئی۔ اگرچہ غزوۂ بدر سے قبل سورۃ البقرۃ کے علاوہ سورۂ محمد (ﷺ) بھی نازل ہوئی ہے' جس کا دوسرا نام سورۂ قتال ہے' لیکن اکثر و بیشتر وہ آیات جو ہجرت کے بعد سے لے کر غزوۂ بدر تک نازل ہوئی ہیں' اس سورۂ مبارکہ میں جمع کی گئی ہیں' اگرچہ چند ایک مستثنیات ہیں۔ سود یعنی ربا سے متعلق آخری آیات سن ۹ ہجری میں نازل ہوئی تھیں لیکن انہیں اس سورۃ میں شامل کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس سورۂ مبارکہ کی آخری دو آیات زمین پر نہیں بلکہ معراج میں اُمت کے لئے تحفہ کے طور پر عطا ہوئی ہیں۔

اس سورۃ کے مضامین کے تجزیہ کے ضمن میں مَیں نے اسے ''سورۃُ الاُمّتَین'' کا نام دیا ہے' یعنی یہ دو اُمتوں کی سورۃ ہے' اس میں سابقہ اُمت بنی اسرائیل اور موجودہ اُمت مسلمہ' دونوں سے خطاب ہے۔ چنانچہ نمایاں طور پر اس کے دو حصے ہیں' جو تقریباً مساوی ہیں' گو آیات کی تعداد میں قدرے فرق ہے۔ پہلے حصے میں ۱۵۲ آیات اور ۱۸ رکوع ہیں جبکہ دوسرے حصے میں ۱۳۴ آیات اور ۲۲ رکوع ہیں۔ گویا پہلا حصہ آیات

کے اعتبار سے بھاری ہے جبکہ نصف ثانی میں رکوعوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ یہ سورۃ تقریباً دو برابر حصوں میں منقسم ہے۔ سورۃ الفاتحہ کے بارے میں تو ایک حدیث قدسی کی رو سے اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ ((قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ)) ''میں نے نماز (مراد سورۃ الفاتحہ) کو اپنے اور بندے کے درمیان دو برابر حصوں میں تقسیم کر لیا ہے۔'' اسی کا عکس یا پرتو سورۃ البقرۃ ہے جو سورۃ الفاتحہ کے فوراً بعد شروع ہو رہی ہے اور اسے بھی اللہ نے دو برابر برابر حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

پہلے حصہ میں اصل روئے سخن بنی اسرائیل کی طرف ہے جبکہ دوسرے حصہ میں تمام تر خطاب اُمتِ محمدؐ سے ہے۔ اس کی مزید تقسیم کے بارے میں مَیں ''قرآن حکیم کی سورتوں کا اجمالی تجزیہ'' نامی کتاب میں لکھ بھی چکا ہوں' یعنی پہلے حصہ میں ایک عمودی تقسیم ہے کہ پہلے ۴' پھر ۱۰ اور اس کے بعد پھر ۴' کل ۱۸ رکوع۔ اور چار ہی مضامین کی لڑیاں نصف ثانی میں چلتی ہیں جو آپس میں بٹی ہوئی ہیں۔ یہ گویا افقی (horizontal) تقسیم ہوگی۔ یعنی ایک تو شریعت کے احکام جو اوّلاً عقائد و ایمانیات اور ثانیاً عبادات و معاملات اور اوامر و نواہی وغیرہ پر مشتمل ہیں' دوسرے اللہ کی راہ میں جہاد جس کی دو شاخیں جہاد بالمال یعنی انفاق فی سبیل اللہ اور جہاد بالنفس یعنی قتال فی سبیل اللہ ہیں۔ یہ چار لڑیاں ہیں جو نصف ثانی میں چلتی ہیں اور آپس میں بٹی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہاں آپ ان مضامین کو رکوعوں میں تقسیم نہیں کر سکتے' کیونکہ یہ لڑیاں مسلسل چلتی ہیں' مگر آپس میں بٹی ہونے کی وجہ سے پہلے ایک مضمون آئے گا' پھر دوسرا' تیسرا' چوتھا اور پھر پہلا۔ جیسے چار مختلف رنگ کی ڈوریاں ہوں' انہیں اگر رسّی کی شکل میں بٹ دیا جائے تو ایک طرف سے دیکھنے پر چاروں رنگ کٹے پھٹے نظر آئیں گے لیکن رسّی کو کھول دیا جائے تو ہر ڈوری مسلسل نظر آئے گی۔ اس طرح چار مضامین کی ڈوریاں اگرچہ اپنی جگہ مسلسل ہیں لیکن چونکہ انہیں بٹ دیا گیا ہے' اس لئے ان میں تسلسل دکھائی نہیں دیتا' حالانکہ معنوی تسلسل موجود ہے۔

جہاں تک پہلے حصہ کا تعلق ہے اس کے پہلے چار رکوع تمہیدی اور آخری چار رکوع تحویلی ہیں' جبکہ درمیان کے دس رکوعوں میں براہِ راست بنی اسرائیل سے خطاب ہے۔ پہلے چار رکوعوں میں سے ابتدائی دو رکوعوں میں تین قسم کے انسانوں کی تقسیم ہے' یعنی وہ جنہوں نے قرآن حکیم سے صحیح استفادہ کیا' اس پر ایمان لائے' اس سے انہوں نے اپنے قلوب واذہان کو بھی منور کیا اور اپنے سیرت وکردار کو بھی مزین کیا۔ دوسرے وہ جو تکبر' ضد اور حسد کی بنا پر اس کے انکار اور کفر پر اڑ گئے اور تیسرے وہ جو بین بین رہے اور جن کی زیادہ تفصیل دوسرے رکوع میں آئی ہے' اس لئے کہ یہ تیسرا طبقہ ہی تھا جو ہجرت کے بعد مدینہ میں نمایاں طور پر سامنے آیا' مکہ مکرمہ میں یہ تیسرا طبقہ موجود نہیں تھا' اگر تھا بھی تو نہ ہونے کے برابر۔ بعد کے دو رکوعوں میں قرآن کی دعوت اور قرآن کا بنیادی فلسفہ بیان ہوا ہے' گویا مکی قرآن کا لب لباب ہے جو سورۂ بقرہ کے تیسرے اور چوتھے رکوع میں ہے۔ دعوت کے اعتبار سے تیسرا اور فلسفہ وحکمت کے اعتبار سے چوتھا رکوع اہم ہے۔ یہ چاروں رکوع تمہیدی ہیں۔

اس کے بعد بنی اسرائیل سے خطاب شروع ہوتا ہے۔ ان دس رکوعوں میں جو تقسیم ہے وہ بعد میں بیان کی جائے گی۔ ان کے بعد چار رکوع تحویلی ہیں' یعنی جن میں تحویل قبلہ کا حکم ہے' اور تحویل قبلہ دراصل اس بات کی علامت تھی کہ سابقہ اُمت مسلمہ کو' جس کا مرکز یروشلم رہا' معزول کر کے اب ایک نئی اُمت' اُمت محمد (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی تاسیس ہوئی ہے' جس کا مرکز بیت اللہ ہے۔ گویا سابقہ اُمت مسلمہ بنی اسرائیل کو جسے دو ہزار سال تک اللہ کی نمائندہ اُمت ہونے کا شرف حاصل رہا' اب اس منصب سے معزول کیا جا رہا ہے اور ایک نئی اُمت' جو محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے' اب اسے اس روئے ارضی پر اس مقام پر فائز کیا جا رہا ہے اور یہ مقام اسے اب تا قیام قیامت حاصل رہے گا۔

سورۂ بقرہ کے پندرہویں اور سولہویں رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کو نمایاں کیا گیا ہے' اس لئے کہ خانہ کعبہ جسے اس نئی اُمت کا مرکز بنایا جا رہا ہے' کی تعمیر

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے کی تھی۔ان کے بعد ۱۷ اور ۱۸' دو رکوع تحویل قبلہ سے متعلق ہیں۔

اب درمیان کے دس رکوع (۵ تا ۱۴) جن میں بنی اسرائیل سے خطاب ہے'ان میں جو اہم نکتہ ہے اسے اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس حصہ کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر لیں۔ پہلے (پانچویں) رکوع کی ۷ آیات بنی اسرائیل کو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی پرزور دعوت پر مشتمل ہیں۔ بنی اسرائیل سے خطاب کے ذیل میں یہ سات آیات گویا بمنزلہ ''فاتحہ'' کے ہیں۔سورۂ فاتحہ کی بھی سات آیات ہیں'اسی طرح بنی اسرائیل کو دعوت کے ضمن میں یہ سات آیات بہت ہی اہم ہیں۔اس کے بعد بقیہ ۹ رکوعوں (۶ تا ۱۴) کے شروع اور اختتام پر بھی دو دو آیات بالکل انہی معنوں میں ہیں۔ چھٹے رکوع اور پھر پندرہویں رکوع کی پہلی آیت کا آغاز انہی الفاظ میں ہوا ہے جو پانچویں رکوع کے آغاز میں آئے ہیں'یعنی ﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ﴾

چھٹے رکوع کی پہلی دو آیات اور پندرہویں رکوع کی پہلی دو آیات گویا ریاضی کے بریکٹس کے مانند ہیں اور اس طرح یہ ۹ رکوع بریکٹس کے اندر شمار ہوں گے۔ بریکٹس کے اندر کا تمام تر حصہ بنی اسرائیل کی ملامت پر مشتمل ہے جس میں ان کے جرائم اور ان پر عائد فرد جرم کا تذکرہ ہے۔ چنانچہ ریاضی کے اصول کی رو سے بریکٹس کے اندر کے ۹ رکوع (۶ تا ۱۴) شروع کے رکوع نمبر ۵ کی سات آیات کے تابع تصور ہوں گے۔ یہ باتیں یہاں اس لئے دہرائی جا رہی ہیں تاکہ زیر بحث آیات کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

ایک بات مزید نوٹ کر لیجئے کہ اس سے قبل ہم چھٹے اور ساتویں رکوع کا مطالعہ مکمل کر چکے ہیں جن میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے بہت سے واقعات کا تذکرہ ہوا ہے اور ان کے طرزِ عمل کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان دو رکوعوں میں ایک اعتبار سے مضمون مکمل ہو گیا ہے'اس لئے کہ چھٹا رکوع شروع ہو رہا ہے ﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ

اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾ کے الفاظ سے اور ساتواں رکوع ختم ہو رہا ہے ان الفاظ پر: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ..... ﴾ (الآیۃ)۔ چنانچہ یہاں کوئی عقیدہ والی بات نہیں آئی ہے۔ البتہ اب ہم جس حصہ کا آغاز کر رہے ہیں اس میں فکری اور نظریاتی باتیں بھی شامل ہیں' یعنی حالات و واقعات کا تجزیہ اور ان کی تہہ میں جو فکری اور نظریاتی غلطیاں کارفرما تھیں' اور ان کے عقائد میں جو کجی پیدا ہو گئی تھی اس کا بیان ہے' اور یہ حصہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں حکمت قرآنی کے بہت بڑے خزانوں پر مشتمل بہت قیمتی آیات شامل ہیں۔ اور یہ درحقیقت موجودہ اُمت مسلمہ کے لئے بھی ایک پیشگی تنبیہہ ہے کہ سابقہ اُمت مسلمہ جن غلط نظریات' عقائد' خیالات اور طرزِ عمل کی بنا پر اس انجامِ بد کو پہنچی ہے تم بھی کہیں اسی کو اختیار نہ کر لینا' کیونکہ ظاہر ہے غلط اعمال و افعال' غلط عقائد و نظریات کا ہی نتیجہ ہوتے ہیں۔ انسانی شخصیت کے یہ دو پہلو ہیں' ایک عقائد و نظریات اور دوسرے اعمال و افعال' جن کے درمیان گہرا رشتہ ہے۔ اگر کسی شخص سے غلط اعمال سرزد ہوتے ہیں تو یقیناً ان کے پیچھے اس شخص کے غلط افکار و نظریات ہیں۔ تو ان حصوں میں آپ دیکھیں گے کہ نہ صرف واقعاتی طور پر تجزیہ کیا جا رہا ہے بلکہ ان کی تہہ میں جو فکری گمراہی ہے اس کی نشاندہی بھی کی جا رہی ہے۔ یہ گویا ایک عالمی سچائی اور ابدی حقیقت ہے جو بتائی جا رہی ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں جو متفق علیہ ہے' نبی کریم ﷺ نے بتا دیا تھا کہ اے مسلمانو! تمہارے اندر بھی وہ خرابیاں پیدا ہوں گی جو پہلی اُمتوں میں پیدا ہوئیں۔ آپؐ نے فرمایا:

((لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَّذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰى لَوْ سَلَكُوْا جُحْرَ ضَبٍّ لَسَلَكْتُمُوْهُ)) قُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى؟ قَالَ: ((فَمَنْ!))

''اے مسلمانو! تم بھی لازماً اتباع کرو گے انہی لوگوں کے طریقہ کا جو تم سے پہلے تھے' بالشت کے ساتھ بالشت اور ہاتھ کے ساتھ ہاتھ (جیسا کہ محاورہ ہے کہ تم انہی کے نقش قدم پر چلو گے) حتیٰ کہ وہ اگر کسی گوہ کے بل میں گھسے تھے تو تم بھی گھسو گے۔'' صحابیؓ کہتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! کیا

یہود و نصاریٰ؟'' (یعنی کیا آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں کہ ان کے اندر جو اعتقادی اور عملی خرابیاں تھیں وہ ہمارے اندر بھی آ جائیں گی؟) آپؐ نے فرمایا: ''اور کون؟''

گویا یہ ایک پیشگی تنبیہہ تو ہے ہی' ستم ظریفی کہئے کہ واقعہ بھی یہی ہے کہ وہی نظری و اعتقادی گمراہیاں' وہی عملی خرابیاں' جو وہاں تھیں' یہاں بھی آئی ہیں۔ بہرحال جہاں تک تنبیہہ اور نشاندہی کا تعلق ہے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔

آیت قرآنی سے غلط استدلال

اس تمہید کے بعد اب ہم اس حصہ کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں۔

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـُٔوۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ﴾ (آیت ٦٢)

سورۃ البقرۃ کے آٹھویں رکوع کی اس پہلی آیت کو خاصی controversial اور مغالطہ آمیز بنا دیا گیا ہے۔ پہلے بھی جب کبھی اس طرح کا فتنہ اٹھا ہوگا تو اس آیت کا حوالہ دیا گیا ہوگا۔ آیت زیر مطالعہ اور سورۃ المائدۃ کی آیت ٦٩ کے حوالہ سے ایک بہت بڑا فتنہ ''وحدتِ ادیان'' کھڑا کیا گیا تھا۔

فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو مسلمان بنے۔'' میں نے یہاں ''جو ایمان لائے'' ترجمہ نہیں کیا' اس لئے کہ اہل ایمان سے مراد مسلمان ہیں' چاہے وہ حقیقت میں مؤمن ہوں یا منافق۔ جو صرف قانونی مسلمان ہوتے ہیں قرآن ان سے بھی ''اے ایمان والو'' کہہ کر خطاب کرتا ہے' اس لئے کہ قانونی ایمان تو انہیں بہرحال حاصل ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء کی آیت ١٣٦ ملاحظہ ہو:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَالۡكِتٰبِ الَّذِیۡ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوۡلِهٖ وَالۡكِتٰبِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ مِنۡ قَبۡلُ ؕ﴾

''اے ایمان کے دعوے دارو! ایمان لاؤ (جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے) اللہ پر' اللہ کے رسولوں پر' اور اُس کتاب پر جو اُس نے اپنے بندے (ﷺ) پر

نازل کی اور اس کتاب پر بھی جو اُس نے پہلے نازل کی۔''

تو آیت زیر مطالعہ کا ترجمہ یوں ہوگا:

''یقیناً جو لوگ مسلمان ہوئے' اور وہ جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی' جو بھی ایمان لایا اللہ پر اور پچھلے دن پر اور جس نے بھی نیک عمل کئے' تو اُن کا اجر ان کے ربّ کے پاس محفوظ ہے' نہ ان کے لئے کوئی خوف ہے اور نہ وہ کسی حزن سے دوچار ہوں گے۔''

یہ اس آیۂ مبارکہ کا لفظی ترجمہ ہوا۔ یہ بات کئی دفعہ واضح کی جا چکی ہے کہ اہم مضامین قرآن حکیم میں کم از کم دو بار ضرور آتے ہیں' لہٰذا اس آیت کی ہم معنی آیت سورۂ مائدہ کی آیت ۶۹ ہے جس کے الفاظ بعینہٖ وہی ہیں جو سورۂ بقرہ کی مذکورہ بالا آیت کے ہیں' البتہ ترتیب میں معمولی سی تبدیلی ہے۔ سورۂ بقرہ میں نصاریٰ پہلے اور صابی بعد میں ہے' وہاں صابی پہلے اور نصاریٰ بعد میں ہے' باقی الفاظ جوں کے توں یہی ہیں۔

اگر قرآن حکیم میں سیاق و سباق اور دیگر مقامات پر جو باتیں آئی ہیں ان سب کو نظر انداز کر دیا جائے اور صرف کسی ایک مقام یا آیت کو توجہ کا مرکز بنا کر اس سے اپنا ایک فلسفہ اخذ کرنے کی کوشش کی جائے تو ان الفاظ سے یہ مغالطہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص خواہ یہودی ہو' نصرانی ہو' صابی ہو' چاہے مسلمان ہو' جو کوئی بھی ایمان رکھتا ہو اللہ پر' یومِ آخر پر اور نیک عمل کرتا ہو تو اس کی نجات یقینی ہے۔ یعنی اس آیت کی رو سے رسالت پر ایمان لازم نہیں آتا۔ گویا محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا نجات کے لئے شرط لازم نہیں۔ اسے ''وحدتِ ادیان'' کا نام دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے نبوت و رسالت پر ایمان سے جو فرق آتا ہے وہ شریعت کا ہے۔ شریعت موسوی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے سے متعلق ہے' شریعت محمدی کا محمد ﷺ پر ایمان لانے پر انحصار ہے۔ چنانچہ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شریعت بھی غیر ضروری ہے۔ اللہ پر اور آخرت پر ایمان اور نیک عمل نجات کے لئے کافی ہے' کوئی شخص نماز پڑھتا ہے یا نہیں پڑھتا' کیسے پڑھتا ہے وغیرہ' یہ ثانوی چیزیں ہیں' نجات کے لئے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں!

یہ فتنہ ہمارے ہاں تین حوالوں سے آیا ہے۔ اوّلاً: تصوف میں ہمہ اوست کا

تصور۔ اگر یہ اصل شکل میں ہو تو پھر کسی مذہب، شریعت یا عبادت کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ جیسا کہ مشہور مصرعہ ہے: ''مسجد، مندر بکو و نور''۔ یعنی مسجد اور مندر میں ایک ہی نور ہے۔ گویا جو بُتوں کو پوجتے ہیں وہ بھی اسی ہستی باری تعالیٰ کو پوجنے والے ہیں، بُت تو محض ایک ذریعہ ہیں، اپنی توجہ مرتکز رکھنے کے لئے بُتوں کو ذریعہ بنایا گیا ہے ورنہ پوجا تو کسی اور ہستی یا ہستیوں کی کی جاتی ہے۔

ثانیاً: اکبرِ اعظم کا ''دینِ الٰہی'' کا فتنہ۔ یہ دونوں فتنے خاص طور پر ہندوستان میں ایک ہی وقت میں اُبھرے ہیں۔ اکبر اگرچہ اَن پڑھ تھا، مگر نہایت ذہین انسان تھا، اسے یہ محسوس ہو گیا تھا کہ مختلف مذاہب اور قومیتوں کی ہندوستان میں یہ جو کھچڑی پکی ہوئی ہے یہ اس کی عظمت اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے، لوگوں میں یکجہتی نہیں ہے اور وہ ایک قوم نہیں بن پاتے، لہٰذا ان مذاہب کے ظاہری فرق و تفاوت کو ختم کر کے ایک ہی مذہب بنا دیا جائے، تاکہ آپس کی کھٹ پٹ کم ہو اور سیاسی اعتبار سے ہندوستان ایک عظیم ملک کی شکل اختیار کر سکے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے اس نے ''دینِ الٰہی'' ایجاد کیا جس کے لئے اس نے قرآن حکیم کا بھی سہارا لیا۔ ابوالفضل اور فیضی جیسے علماء اسے یہ پٹی پڑھانے کے لئے موجود تھے۔

قرآن مجید میں دو جگہ یہ مضمون آیا ہے (سورۂ سجدہ اور سورۂ حج میں) کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تدبیرِ کائنات ہو رہی ہے، اس میں ہمارا ایک ہزار سال اللہ کے ایک دن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اکبر کا کہنا تھا کہ اب دینِ محمدیؐ کو ایک ہزار سال پورے ہو گئے ہیں، محمد ﷺ کا لایا ہوا دین ایک ہزار سال کے لئے تھا لہٰذا اب وہ ختم ہو گیا اور اگلے ہزار سال کے لئے میرے ایجاد کردہ دینِ الٰہی پر عمل کیا جائے۔ اسی حوالے سے اسے ''الف ثانی'' یعنی دوسرا ہزار سالہ دَور کا نام دیا گیا۔ یہ واقعتاً بہت زبردست فتنہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے چونکہ اپنے دین کی حفاظت کی ذمہ داری لے رکھی ہے، یہ آخری دین ہے، اب کوئی نبی تو آئے گا نہیں، البتہ مجددین کا سلسلہ جاری ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے شیخ احمد سرہندیؒ سے ہند میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی کا کام لیا۔ اسی لئے انہیں ''مجدد

الف ثانی'' کہا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کے جداگانہ تشخص' شریعت کی اہمیت اور اتباع سنت کا مقام اجاگر کرنا حضرت مجدد الف ثانیؒ کا بہت بڑا کارنامہ ہے' جس کا یہ نتیجہ تھا کہ اکبر کی موت کے ساتھ ہی دین الٰہی کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

یہ فتنہ گزشتہ صدی میں ہندو مفکرین نے دوبارہ وحدتِ ادیان کے نام سے اٹھایا۔ اس کے لئے برہمو سماج کا تصور پیش کیا گیا' جسے گاندھی نے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا اور ہندوستان میں مختلف مذاہب کے پیروکاروں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی تاکہ ایک متحدہ ہندوستانی قوم وجود میں آئے۔ موجودہ دور میں یہ فتنہ سیکولرزم کی شکل میں پیش کیا گیا ہے' یعنی یہ تصور کہ مذہب انسان کا انفرادی معاملہ ہے' اجتماعی نظام میں اس کا عمل دخل نہیں ہونا چاہئے' ہر ایک کو یہ آزادی حاصل ہے کہ جس مذہب کی چاہے پیروی کرے' جو چاہے عقیدہ رکھے' جس طرح چاہے عبادت کرے' البتہ سیاسی' معاشرتی اور معاشی زندگی کے اصول طے کرنا لوگوں کی آزاد مرضی پر منحصر ہے۔ گویا کہ جو بات دین الٰہی یا وحدتِ ادیان کے نام سے پیش کی جاتی رہی ہے اسے جدید انداز میں سیکولرزم کا نام دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کو تقویت فراہم کرنے کے لئے قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت کا ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جانا پہلی مرتبہ نہیں ہے۔

اس تمام نظریہ کی نفی کے لئے پانچویں رکوع کی وہ آیات موجود ہیں جن میں یہود کو محمد ﷺ پر ایمان لانے کی پرزور دعوت دی گئی ہے اور جو بعد کے دس رکوعوں میں شامل آیات کے لئے ایک مشترک عنوان (Common Factor) کے طور پر لائی گئی ہیں۔

''وحدتِ ادیان'' کا قرآنی تصور

وحدتِ ادیان کا مذکورہ بالا نظریہ یقیناً پرلے درجے کی گمراہی ہے' تاہم وحدتِ ادیان کا جو تصور ہمیں قرآن حکیم سے ملتا ہے وہ یہ ہے کہ تمام انبیاء و رُسل کی دعوت دین اسلام ہی کی دعوت تھی۔ اس طرح کہ تمام ادیان اصلاً ایک ہیں' دنیا میں جتنے بھی ادیان ہیں ان کا origin ایک ہے۔ ظاہر ہے تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور حضرت

آدمؑ اللہ کے نبی تھے' چنانچہ دنیا میں جتنے بھی انبیاء ورسل آئے ہیں وہ یقیناً دین اسلام کے ہی حامل تھے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر جو لوگ ایمان لائے تھے وہ بلاشبہ دین حق کے پیروکار تھے۔ مثلاً سورۂ یونس کی آیت ۱۹ میں فرمایا گیا:

﴿وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۭ﴾

''اور نہیں تھے تمام انسان مگر ایک اُمت' پھر انہوں نے باہم اختلاف کیا۔''

یعنی ابتداءً سارے انسان ایک ہی اُمت تھے' بعد میں انہوں نے مختلف عقیدے اور مسلک بنا لئے۔

یہی مضمون اسی سورۂ بقرہ میں مزید نکھر کر سامنے آتا ہے۔ فرمایا:

﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۠ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (آیت ۲۱۳)

''ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے۔ (پھر یہ حالت نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے۔) تب اللہ نے نبی بھیجے جو (راست روی پر) بشارت دینے والے اور (کج روی کے نتائج سے) خبردار کرنے والے تھے' اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ (حق کے بارے میں) لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے ——— (اور ان اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق بتایا نہیں گیا تھا۔ نہیں) اختلاف ان لوگوں نے کیا جنہیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انہوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لئے حق چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ پس جو لوگ (انبیاءؑ پر) ایمان لائے انہیں اللہ نے اپنے اِذن سے اس حق کا راستہ دکھایا جس میں انہوں نے اختلاف کیا تھا۔ اللہ جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے۔''

چنانچہ یہ اختلاف اندھیرے میں نہیں ہوتا' باہم ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہوتا

ہے' انسان جان بوجھ کر ٹھوکر کھاتا ہے' ایک دوسرے پر سبقت اور بالادستی حاصل کرنے کی خاطر حق سے اعراض کرتے ہوئے غلط راستے اختیار کرتا ہے' ورنہ یہ بات نہیں کہ حق نظر نہیں آتا۔ ابوجہل مانتا تھا کہ محمد ﷺ جھوٹ نہیں بولتے' لیکن خاندانی اور گروہی رقابت آڑے آتی تھی۔

شروع میں تمام انسان ایک تھے اور ایک ہی دین تھا۔ یہودیت' نصرانیت اور صابیت کا تعلق چونکہ اسی علاقے سے تھا جہاں قرآن حکیم نازل ہو رہا تھا اور اس لئے بھی کہ ان کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تھا لہٰذا قرآن حکیم میں ان کا ذکر ہے' ورنہ دنیا کے دیگر مذاہب بھی اصلاً اسلام ہی تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد تو انہی کی نسل سے تمام انبیاء آئے ہیں لیکن ان سے قبل حضرت نوح علیہ السلام کی نسل سے بھی تو یقیناً انبیاء ہوں گے جن کے پیروکار دنیا میں رہے ہوں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب ان کا اصل دین سے دُور کا تعلق بھی باقی نہیں رہ گیا' تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب دین اسلام ہی کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔

وحدت کی انسانی خواہش اور اللہ تعالیٰ کی حکمت تخلیق

میرے نزدیک وحدتِ ادیان کی خواہش کا ابھرنا ایک فطری امر ہے' کیونکہ کوئی بھی انسان ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل کشاکش یا محاذ آرائی کی حالت میں رہنا پسند نہیں کرتا' خاص طور پر آج کی دنیا میں اس خواہش نے شدت اختیار کر لی ہے' اس لئے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کے نتیجہ میں مختلف خطوں کے درمیان فاصلے بالکل کم ہو کر رہ گئے ہیں' دنیا سکڑ کر ایک عالمی گاؤں (global village) کی شکل اختیار کر گئی ہے' اور یہ جو تفرقات ہیں' خصوصاً مذہب کی بنیاد پر' ان میں بڑی شدت ہوتی ہے۔ گویا یہ خواہش تو طبعی ہے' انسان مل جل کر امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ گاہے سیاسی ضرورت اور گاہے روحانی و مذہبی تقاضے کے طور پر مختلف اوقات میں یہ فلسفہ سامنے آتا رہا ہے' لیکن ہمارے لئے اصل بات یہ ہے کہ قرآن حکیم اس بارے میں کیا کہتا ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے بات بالکل دوسری ہے' اللہ کا اپنا

الگ اصول اور تقاضا ہے' نہ کہ جو ہم چاہتے ہیں وہی اللہ کا بھی مقصد اور مدعا ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝﴾ (الشوریٰ:۸)

''اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا' مگر وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے' اور ظالموں کا نہ کوئی ولی ہے نہ مددگار۔''

اللہ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک اُمت بنا دیتا' سب حقیقی مسلمان ہوتے' اللہ کے لئے یہ کوئی مشکل نہیں تھا' لیکن اللہ کے پیش نظر یہ ہے ہی نہیں' اللہ نے تو انسان کو امتحان اور آزمائش کے لئے پیدا کیا ہے' اس لئے جو انسان اللہ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کی کوشش کرے گا صرف اسی کو جنت میں داخلہ ملے گا' یہ نہیں کہ سب کے لئے جنت تیار کر رکھی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انبیاءِ کرام اور کتابیں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی' ایک ہی طرح سب انسانوں کو نیک بنا دیا جاتا۔

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ﴾ (النحل:۹۳)

''اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی (کہ تم میں کوئی اختلاف نہ ہو) تو وہ تم سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا' مگر وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈالتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے۔''

دونوں آیات میں تقریباً ایک جیسے الفاظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تخلیق ہی یہ ہے۔ یہ دُنیوی زندگی ایک آزمائش ہے' یہاں ایک درجہ بندی ہو کر رہنی ہے اور اس کی بنیاد یہی ہے کہ جو نیکی کا طلبگار ہوگا اللہ اسے ہدایت دے گا اور جو گمراہی کی روش اختیار کرے گا اسے گمراہی ملے گی۔

سورۂ ہود کی آیات ۱۱۸' ۱۱۹ ملاحظہ ہوں:

﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ﴾

''اور اگر تیرا ربّ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی اُمت بنا دیتا' مگر اب تو وہ مختلف طریقوں پر ہی چلتے رہیں گے' سوائے ان کے جن پر تیرے ربّ کی رحمت ہے (وہ بے راہ رویوں سے بچتے رہیں گے)——اور اسی (آزادیٔ انتخاب واختیار اور امتحان) کے لئے تو اللہ نے انہیں پیدا کیا تھا۔''

آخری طور پر یہ مضمون سورۃ المائدہ میں آیا ہے جو مدنی سورہ ہے' پہلی تینوں مکی سورتیں تھیں۔ فرمایا:

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَا اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ۝﴾ (آیت ۴۸)

''اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں ایک اُمت بھی بنا سکتا تھا' لیکن اس نے یہ اس لئے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے' لہٰذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخر کار تم سب کو اللہ ہی کی طرف جانا ہے' پھر وہ تمہیں اصل حقیقت بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔''

لہٰذا اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ہمیں یہ بات خواہ کتنی ہی بھلی نظر آئے اور کتنی ہی وقتی تقاضوں پر مبنی محسوس ہو لیکن تمام انسانوں کا ایک اُمت ہونا اللہ تعالیٰ کے مقصدِ تخلیق کے منافی ہے۔ یہاں تو سیدھی سیدھی بات ہے کہ جو حق ہے اس کا بول بالا کرو' اس پر جمے رہو' ڈٹے رہو' محض رواداری' یکجہتی یا کوئی اتحاد پیدا کرنے کے لئے لچک دکھانا اور کچھ give and take کرنا حق سے انحراف اور مداہنت ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کو فرمایا گیا:

﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ۝ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ۝﴾ (القلم: ۸'۹)

''آپ ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آئیں۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ آپ کچھ ڈھیلے پڑیں تو یہ بھی (آپ کی مخالفت میں) کچھ نرمی اختیار کر لیں۔''

وہ تو چاہتے ہیں کہ آپؐ مداہنت کریں' لیکن آپؐ ہرگز ان کی باتوں پر توجہ نہ دیجئے اور اس پر ڈٹے رہئے جس کا آپ کو حکم دیا گیا ہے۔

اس کا تعلق اس حدیث سے بھی جڑتا ہے جس میں فرمایا گیا کہ ((بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا)) اسلام کا آغاز اس حال میں ہوا تھا کہ غریب یعنی اجنبی تھا۔ جاننے پہچاننے والے کم تھے۔ پھر اسے غلبہ حاصل ہوا اور جسے غلبہ حاصل ہوا اُس کے سبھی دوست ہوتے ہیں۔ فرمایا: ((وَسَيَعُودُ غَرِيبًا كَمَا بَدَأَ)) اسلام عنقریب ایسا ہی ہو جائے گا جیسا شروع میں اجنبی تھا۔ مسلمان اگرچہ بہت ہوں گے' مگر اسلام غریب ہوگا۔ آج دنیا میں ڈیڑھ ارب کے لگ بھگ مسلمان ہیں' لیکن اسلام کہاں ہے؟ چنانچہ اسلام کے مطابق کوئی شخص زندگی گزارنا چاہے گا تو وہ معاشرے میں اجنبی ہو کر رہ جائے گا۔ آپ اس کا فیصلہ کر لیں تو آپ کے قریب کوئی نہیں آئے گا' لوگوں کو آپ کے ساتھ رشتہ داری پسند نہیں ہوگی' آپ کو دقیانوسی اور رجعت پسند شمار کیا جائے گا۔ تو فرمایا: ((فَطُوبٰى لِلْغُرَبَاءِ)) پس مبارکباد ہے ان لوگوں کو جو خود اجنبی بننا گوارا کر لیں لیکن اسلام کا دامن نہ چھوڑیں۔ (مسلم' بروایت ابو ہریرہؓ)

میثاق النبیین

اب اس سلسلہ میں ایک اور دلیل نوٹ کیجئے اور وہ ہے ''میثاق النبیّین'':

﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ (آل عمران: ۸۱)

''ذرا یاد کرو جب اللہ نے تمام نبیوں سے یہ عہد لیا تھا کہ جو کچھ میں نے تمہیں کتاب اور حکمت سے عطا کیا ہے' پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہے تو تم کو اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی۔ فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا؟ انہوں نے کہا ہاں ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا تو اب گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں''۔

اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں سے ایک عہد لیا تھا' جیسا کہ میثاقِ الست تھا جو تمام

انسانوں سے لیا گیا تھا اور جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانوں کے جسمانی وجود سے بہت پہلے ارواحِ انسانی پیدا کی گئی تھیں۔ اسی طرح انبیاء کرام کی ارواح سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ جب میں تم میں سے کسی کو کتاب اور حکمت دوں گا اور اس کے بعد کوئی اور نبی آئے گا جو تصدیق کرے گا اس کی جو اس سے پہلے انبیاء کو دیا گیا تھا تو تم لازماً اس پر ایمان لاؤ گے اور لازماً اس کی مدد کرو گے۔ مطلب یہ کہ ایک نبی آئے' اللہ نے انہیں کتاب دی' حکمت سے نوازا' ان کے جو پیروکار ہیں وہ ایک اُمت بن گئے' اب ان کے بعد ایک اور نبی آ گئے' تو سابقہ انبیاء کے پیروکاروں پر لازم ہے کہ نئے آنے والے نبی پر ایمان لائیں اور ان کے دست و بازو بنیں۔ اللہ نے آخر میں سوال کیا: کیا تم نے اقرار کیا اور میرے اس عہد اور میثاق کو قبول کیا؟ تو انہوں نے کہا: ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا: گواہ رہنا' اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ رہوں گا۔ ہر نبی کے ذریعے سے اس کی اُمت سے جب اللہ نے یہ عہد لیا ہے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ بس نجات کے لئے اپنے اپنے نبی پر ایمان رکھنا کافی ہو جائے گا۔ یہ تصور اس آیہ مبارکہ کی قطعی نفی ہے۔

بنی اسرائیل کا اللہ تعالیٰ سے عہد

خاص طور پر بنی اسرائیل کا جو عہد تھا اس کو بھی نوٹ کر لیجئے۔ سورۂ بقرہ کے پانچویں رکوع میں بنی اسرائیل سے جو کہا جا رہا ہے کہ ﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ ''تم میرا عہد پورا کرو تا کہ میں تم سے اپنا عہد پورا کروں'' وہ کون سا خصوصی عہد تھا جو بنی اسرائیل سے ہوا ہے۔ اس ضمن میں سورۂ اعراف کی آیات ۱۵۶۔۱۵۸ بہت اہم ہیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت آئی اور حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے چیدہ افراد کو لے کر کوہ طور پر گئے تو وہاں انہوں نے درخواست پیش کی تھی کہ: ﴿وَاكْتُبْ لَنَا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَا اِلَیْكَ﴾ ''اے ربّ! ہمارے لئے اس دنیا اور آخرت کی زندگی میں خیر اور بھلائی مقدر کر دے' ہم تیری ہی جناب میں رجوع کرتے ہیں۔'' اس لفظ (هُدْنَا) کو نوٹ کیجئے' اس لئے کہ اس لفظ کا یہود کے ساتھ بھی تعلق ہے' یعنی لوٹنا' رجوع کرنا' پلٹنا۔

﴿قَالَ عَذَابِيْ أُصِيْبُ بِهٖ مَنْ أَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْإِنْجِيْلِ ۡ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْ أُنْزِلَ مَعَهٗ ۙ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ (الاعراف:۱۵۶۔۱۵۷)

''(اللہ تعالیٰ نے جواب میں) فرمایا: جہاں تک میرے عذاب کا تعلق ہے وہ تو میں دوں گا جس کو چاہوں گا' مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ (یعنی میری یہ رحمت سب کے لئے عام ہے' ہر شے کا وجود میری رحمت کا ہی مرہونِ منت ہے) لیکن میری خاص رحمت ان لوگوں کے لئے ہے جو تقویٰ کی روش اختیار کریں گے' زکوٰۃ ادا کریں گے اور ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔ اور وہ لوگ جو اتباع کریں گے اس پیغمبر' نبی اُمّیؐ کا جس کا ذکر وہ موجود پائیں گے اپنے ہاں (پیشین گوئی کے طور پر) تورات اور انجیل دونوں میں لکھا ہوا۔ وہ انہیں نیکیوں کا حکم دے گا' بدی سے روکے گا' تمام پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال ٹھہرائے گا اور ناپاک و نجس چیزوں کو حرام قرار دے گا' اور ان پر پڑے ہوئے ناروا بوجھ ان سے اتارے گا اور انہیں ان بندشوں سے نجات دلائے گا جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جو لوگ ان پر ایمان لائیں گے' ان کی تعظیم کریں گے' مدد کریں گے اور اس نور کا اتباع کریں گے جو ان کے ساتھ نازل کیا جائے گا' وہی لوگ فلاح پائیں گے۔''

بنی اسرائیل سے یہ عہد محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کے لئے لیا گیا تھا۔ چنانچہ اگلی آیت میں نبی کریم ﷺ سے فرمایا گیا:

﴿قُلْ يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝﴾

''(اے نبیؐ! ڈنکے کی چوٹ) کہیے کہ اے لوگو! میں تم سب کے لئے اس اللہ کا رسول ہوں جس کی بادشاہی تمام زمین و آسمان پر ہے' اس کے سوا کوئی معبود نہیں' وہی زندگی اور موت دینے والا ہے' پس ایمان لاؤ اس نبی اُمّی رسول پر جو اللہ اور اس کے ارشادات پر ایمان رکھتا ہے (اللہ کی تمام سابقہ کتابوں پر ایمان رکھتا ہے) تاکہ تم فلاح سے ہمکنار ہو۔''

قرآن حکیم کی متذکرہ بالا آیات کی روشنی میں درج ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں:

۱) سیاق و سباق سے ہٹ کر صرف کسی ایک آیت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا نجات کی شرط لازم نہیں ہے' محض کجی اور گمراہی ہے۔

۲) انبیاء کرام علیہم السلام سے لئے گئے عہد کی رو سے ہر نئے آنے والے نبی پر ایمان لانا لازم تھا۔

۳) بنی اسرائیل سے خاص طور پر یہ عہد لیا گیا تھا کہ وہ نبی آخرالزماں' محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائیں گے۔

زیر مطالعہ آیت کا اصل مفہوم

اب ذرا اس آیت زیر مطالعہ کے الفاظ پر بھی غور کر لیں۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے۔'' مراد مسلمان ہیں۔ ہمیں درحقیقت یہ دیکھنا ہے کہ یہ آیت کس مقصد اور مفہوم میں یہاں آئی ہے۔ تمام انسانوں اور اُمتوں کا ایک مشترک روگ یہ ہے کہ وہ کسی ملت یا اُمت میں شامل ہونے کے بعد اس زعم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کی نجات کا انحصار صرف اس اُمت میں شمولیت پر ہے حالانکہ اُمت میں شامل ہونا اخروی نجات کی قطعاً ضمانت نہیں ہے' کیونکہ اخروی نجات کے لئے اپنا ذاتی ایمان اور نیک عمل کا ہونا لازم ہے۔ یہ تصور کہ چونکہ ''تیرے محبوب کی اُمت سے ہیں'' لہٰذا جنت ہمارا حق ہے' عمل خواہ کچھ بھی ہو' ایک باطل تصور ہے۔ یہ مغالطہ بنی اسرائیل کو ہوا اور ہر ایک کو ہو جاتا ہے' حالانکہ ایک شخص اللہ کے نبی ﷺ کے ساتھ مل کر دشمن کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے شہید ہو جاتا ہے' لوگ کہتے ہیں کہ سیدھا جنت میں گیا' لیکن نبی ﷺ فرماتے ہیں: میں نے اسے جہنم میں

دیکھا ہے' اس لئے کہ زخموں کی تاب نہ لا کر اس نے خودکشی کر لی تھی جو حرام ہے۔

نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا: کوئی شخص اپنی شجاعت اور بہادری کے اظہار کے لئے جنگ کرتا ہے' کوئی حمیت جاہلی کی وجہ سے' کسی خاص قبیلہ سے خاندانی دشمنی کی بنا پر' کوئی مال غنیمت کی طلب میں' ان میں سے کون مجاہد فی سبیل اللہ شمار ہوگا؟ فرمایا: کوئی بھی نہیں' بلکہ ((مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) یعنی جہاد فی سبیل اللہ صرف اور صرف اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے ہوگا۔ میں نے اپنی کتاب ''سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کا ماضی' حال اور مستقبل'' میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ دنیا میں قوموں پر جو عذاب آتا ہے وہ اجتماعی ہوتا ہے لہٰذا اس میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ﴾ (الانفال:۲۵) ''ڈرو اس عذاب سے جو صرف ظالموں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے گا۔'' لیکن اس کے بالکل برعکس آخرت کا معاملہ فرداً فرداً ہوگا۔ یعنی دنیا میں اجتماعی مگر آخرت میں انفرادی معاملہ ہوگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک اُمت موسوی ہی اُمت مسلمہ تھی' مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد یہود کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا لازم تھا۔ اسی طرح محمد رسول اللہ ﷺ کی آمد تک حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والے اُمت مسلمہ تھے جبکہ اس کے بعد محمد ﷺ پر ایمان لانا شرط لازم ہے۔ البتہ نجاتِ اُخروی کا انحصار نہ حضرت موسیٰؑ یا حضرت عیسیٰؑ کی اُمت میں ہونے پر تھا اور نہ اب اُمت محمدؐ میں ہونے پر ہے۔ لہٰذا مذکورہ آیت سے جن مضامین کا آغاز ہو رہا ہے ان کا تعلق انہی غلط نظریات اور تصورات کی نفی سے ہے۔ اس کے بعد وہ مضامین ہیں جن کا تعلق اہل یہود پر تاریخی حوالہ سے ان کی واقعاتی غلطیوں کی بنا پر عائد کردہ فرد جرم سے ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے بعد فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ هَادُوْا﴾ اب دیکھئے یہاں لفظ بنی اسرائیل نہیں آیا' بلکہ الَّذِيْنَ هَادُوْا آیا ہے' اور یہ وہ الفاظ ہیں جو حضرت موسیٰؑ نے دینِ حق پر ہونے کی بنیاد پر استعمال کئے تھے ﴿اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ﴾۔ اگرچہ یہود یوں

نے اپنے لئے حضرت یعقوبؑ کے چوتھے بیٹے یہوواہ کی نسل سے ہونے کو بنیاد بنایا ہے۔ یہی نام عیسائیوں کے ایک فرقہ کا بھی ہے ''یہوواز وٹنیسز'' (JEHOVAS WITNESSES)' یہواہ اللہ کے نام کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ بہرحال یہ جو مسلک بنا' اس میں صرف بنی اسرائیل ہی نہیں' ان کے طور طریقوں کی پیروی کرنے والے دوسرے لوگ بھی شامل ہیں۔ اس لئے یہاں لفظ بنی اسرائیل نہیں آیا۔

اس کے بعد ﴿وَالنَّصٰرٰی﴾ یہ لفظ ﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ﴾ سے ماخوذ ہے۔ اگرچہ ایک دوسری نسبت بھی ہے جو ناصرہ یا نصران نام کے ایک قصبہ کے حوالہ سے ہے' یہ قصبہ بیت المقدس سے ۷۰ میل شمال میں بحیرہ روم کے ساحل سے ۲۰ میل کے فاصلہ پر تھا اور اب بھی موجود ہے۔ اسے نضارت بھی کہتے ہیں اور اسی کی نسبت سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کو مسیح ناصری (Jesus of Nazaret) کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ حضرت مریمؑ کا تعلق اسی قصبہ سے تھا' لیکن قرآن مجید کی رو سے لفظ نصاریٰ کا تعلق ''انصار اللہ'' سے ہے۔ ''نصاریٰ'' حضرت مسیحؑ کے خلیفہ برحق پیٹر یا شمعون کے پیروکار تھے جو حضرت عیسٰیؑ کے اصل دین پر تھے اور وہ بہت عرصہ تک ''نضارین'' بھی کہلاتے رہے۔ سینٹ پال' جو عیسٰی علیہ السلام کی زندگی میں ان کا شدید دشمن تھا' بعد میں اس نے کہا کہ مجھے رؤیاء ہوا ہے اور میں نے حضرت مسیحؑ کا دین اختیار کر لیا ہے۔ حضرت عیسٰیؑ کے دین میں ساری تبدیلیاں اسی کی پیدا کردہ ہیں اور اس کے ایجاد کردہ دین کو ماننے والے اب عیسائی (Christians) کہلاتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہمیشہ لفظ نصاریٰ (Nazaren) آیا ہے۔ حضرت مسیحؑ کو ماننے والے اصل وہ تھے' لہٰذا قرآن صرف ان کا نام لے رہا ہے اور اس حوالہ سے یہ آیت نازل ہو رہی ہے' یعنی جو ان میں شامل تھا وہ اپنے ایمان اور عمل کے ناطے پائے گا' جو پائے گا۔ ظاہر بات ہے جب ان سب کا الگ الگ نام لے کر کہا جا رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اُس وقت جو اصل دین کے پیروکار تھے ان کا یہ معاملہ ہے۔ ان میں کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے تھے اور کچھ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے' جبکہ ہم حضرت موسیٰؑ' حضرت عیسٰیؑ اور حضرت محمد ﷺ

سب کے ماننے والے ہیں۔ چونکہ یہ چیز مشترک تھی اس لئے صرف ایمان اور نیک اعمال کی بات کی گئی ہے۔

صابئین کے بارے میں ہمارے ہاں بہت سے اقوال اور آراء پائی جاتی ہیں۔ اب چونکہ اس نام سے دنیا میں کوئی فرقہ موجود نہیں ہے' لہٰذا اختلافِ رائے کا ہونا غیر معمولی بات نہیں' البتہ ایک بات یقینی ہے کہ یہ بھی اہل کتاب میں سے تھے کیونکہ ان کا تذکرہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ کئے جانے کا مطلب ہی یہ ہے۔ نیز حضرت عمر اور عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہم) کا قول بھی یہی ہے اور امام ابوحنیفہؒ کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ یہ اہل کتاب ہیں اور ان کا ذبیحہ کھانا جائز ہے۔ ان کے بارے دو آراء زیادہ نمایاں ہیں' ایک یہ ہے کہ یہ اپنے آپ کو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی اُمت کہتے تھے اور نزول اسلام کے وقت یہ لوگ ایران اور شام کی سرحد پر کہیں کہیں موجود بھی تھے۔ لیکن میرے نزدیک دوسری رائے زیادہ قرین قیاس ہے' وہ یہ کہ یہ لوگ براہِ راست حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنے آپ کو منسوب کرتے تھے' اس لئے کہ اس آیت میں حضرت محمد ﷺ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمتوں کا نام آیا ہے اور ان اولوالعزم پیغمبروں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی شامل ہیں' جن کا تعلق اسی علاقہ سے تھا' تو ان کے ساتھ بھی کچھ لوگ رہے ہوں گے جو حضرت ابراہیمؑ سے تو اپنے آپ کو منسوب کرتے رہے لیکن ان کے بعد دوسرے کسی پیغمبر پر ایمان نہ لائے۔ آپ کو معلوم ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ایک نسل حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی چلی ہے جو حجاز میں آباد تھی۔ اس نسل میں اڑھائی ہزار سال تک کوئی نبی اور رسول نہیں آئے' لہٰذا یہ کہتے تھے کہ ہم حنفی یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں' گو ان کے پاس نہ کوئی صحیفہ تھا نہ شریعت' اور وہ بدترین شرک میں مبتلا تھے' لیکن آخر اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور انہی میں آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے۔ دوسری شاخ حضرت اسحاق علیہ السلام سے ہے' جس میں دراصل انبیاء و رسل کا تسلسل رہا' اگرچہ حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ منقطع رہا ہے اور اس دوران اس نسل میں بھی کوئی نبی نہیں ہوا'

لیکن پھر حضرت موسیٰ اور عیسیٰؑ کے درمیان دوبارہ یہ سلسلہ تسلسل کے ساتھ جاری رہا ہے۔ نسل انسانی کا یہ چودہ سو سالہ عرصہ اس لحاظ سے بڑا عجیب ہے کہ اس میں نبوت کا تار کہیں ٹوٹا ہی نہیں۔ چنانچہ بخاری و مسلم میں نبی کریم ﷺ کی ایک مشہور حدیث ہے:

((كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَاءِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ ' كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهٗ نَبِيٌّ))

''بنی اسرائیل کی قیادت ہمیشہ انبیاء کے پاس رہی ہے' جب بھی ایک نبی فوت ہو جاتا تو ان کی جگہ دوسرا نبی موجود ہوتا۔''

بلکہ اس سنہری زنجیر کے آغاز میں اور آخر میں بیک وقت دو دو نبی موجود تھے۔ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ حضرت ہارونؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ حضرت یحییٰؑ۔ بہرحال یہ تو ایک بہت ہی غیر معمولی واقعہ ہے' لیکن آپ کو معلوم ہے حضرت ابراہیمؑ کی ایک تیسری بیوی بھی تھیں اور ان سے اولاد بھی ہوئی ہے جو بنی قتورہ کہلاتی تھی۔ ان میں سے ایک شاخ کا تو ہمیں معلوم ہے' جس میں مدین یا مدیان ان کے ایک بیٹے تھے جن کی نسل میں حضرت شعیبؑ کی بعثت ہوئی ہے' لیکن ان کی دوسری اولاد بھی اسی علاقہ میں کہیں آباد تھی۔ اس میں یا تو آگے کوئی نبی نہیں آئے' یا پھر قرآن میں ان کا تذکرہ نہیں ہے اور اگر ان میں کوئی نبی نہیں آئے تو ان میں جو لوگ رہے وہ میرے نزدیک صابئین ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتے رہے۔ اور وہی علاقہ ہے عراق اور شام کا جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد آباد رہی۔ اسی علاقہ میں حضرت یعقوب ابن اسحٰق علیہما السلام کی نسل مصر سے واپس آنے کے بعد رہی ہے' فلسطین میں ان کی حکومت بھی قائم ہوگئی۔ اس لئے حضرت ابراہیمؑ کی تیسری نسل سے جو لوگ تھے وہ ذرا ہٹ کر شام اور عراق کے سرحدی علاقوں میں آباد ہو گئے۔

بہرحال اس آیت کا اصل مفہوم اس طرح ہے: ''یقیناً وہ لوگ جو اسلام لائے اور وہ جو یہودی ہوئے' اور وہ جو نصرانی ہوئے اور جو صابی رہے' ان میں سے جو بھی ایمان لایا اللہ پر اور یوم آخر پر (یعنی اپنے اپنے وقت میں' اپنے اپنے دَور میں) اور اس نے عملِ صالح کی روش اختیار کی تو اللہ کے ہاں ان کا اجر محفوظ ہے' ان کے لئے نہ کوئی خوف ہے' نہ حزن''۔

(باقی صفحہ 48 پر)

مؤمن پر مؤمن کی حفاظت کا فریضہ

کتاب وسنت کی روشنی میں

تحریر: مولانا اخلاق حسین قاسمی

اسلام انسانی اخوت کا پیغام ہے۔ اگر دو انسانوں کے درمیان مذہب اور عقیدہ کا تعلق بھی قائم ہو تو پھر وہ ایمانی اور دینی اخوت ہے جو اخوت کے انسانی رشتہ کو مزید مستحکم اور قوی کر دیتی ہے۔ ایمانی اخوت کا تقاضا شدید تر ہو جاتا ہے کہ ایک دینی بھائی دوسرے دینی بھائی کی جان' مال اور آبرو کی حفاظت کرے۔ اگر حفاظت کرنے کے بجائے ایک مؤمن دوسرے مؤمن کو ہلاک کر دیتا ہے تو اس کی سزا ابدی جہنم قرار دی گئی ہے جو دراصل کفر وانکار کی سزا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّلَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا﴾ (النساء:۹۳)

''اور جو شخص کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی سزا ابدی جہنم ہے اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی پھٹکار نازل ہوتی ہے اور اللہ نے اس کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے''۔

جمہور علماء نے اس کی تاویل کی ہے اور جائز سمجھ کر قتل کرنے والے کو ابدی جہنم کا مستحق قرار دیا ہے' کیونکہ وہ ایک فعل حرام کو فعل حلال سمجھ کر انجام دے رہا ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ قاتل مؤمن کی اصلی سزا یہ ہے' اب اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم پر ہے کہ وہ اس اصلی سزا سے بچا کر ایمان کی برکت سے قاتل مؤمن کو ابدی جہنم سے محفوظ رکھے اور محدود سزا کے بعد اسے نجات عطا فرما دے۔

ترجمان القرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر یہ ہے کہ آیت اپنے

ظاہری معنی پر قائم ہے اور قاتل مؤمن کی توبہ قبول نہیں۔ رسول اکرم ﷺ کی مشہور حدیث ہے:

((سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ)) (متفق علیہ)

''مسلمان کو گالیاں دینا نافرمانی کا عمل ہے اور اسے قتل کرنا کفر کے برابر ہے''۔

اس ضمن میں دورِ نبویؐ کے چند واقعات ملاحظہ ہوں:

محلم بن جثامہ کا واقعہ

محلم بن جثامہ نے ایک لڑائی میں عامر بن اضبط کو قتل کر دیا' جبکہ اس نے مسلمانوں کو السلام علیکم کہا۔ محلم اور عامر کے درمیان پہلے سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔ واپسی پر صحابہ کرام نے حضور ﷺ سے محلم کی شکایت کی۔ محلم اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضور ﷺ سے معافی کی درخواست کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((لاَ غَفَرَ اللّٰهُ لَكَ)) ''اللہ تجھے معاف نہیں کرے گا''۔ یہ سزا سن کر محلم رونے لگا۔ سات دن نہیں گزرے کہ محلم کی وفات ہوگئی۔ لوگوں نے اسے دفن کر دیا' لیکن قبر نے اس کی لاش کو باہر پھینک دیا۔ صحابہؓ نے آ کر حضور ﷺ کو بتایا' آپؐ نے فرمایا:

((اِنَّ الْاَرْضَ تُقْبَلُ مَنْ هُوَ شَرٌّ مِنْ صَاحِبِكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَرَادَ اَنْ يَعِظَكُمْ))

''زمین محلم سے زیادہ شر پسند انسان کو بھی قبول کر لیتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو اس واقعہ سے نصیحت دینے کا ارادہ کیا ہے''۔

پھر آپ ﷺ نے حکم دیا کہ محلم کی لاش کو پہاڑ پر پھینک دو۔ محلم نے ذاتی رنجش کی وجہ سے ایک مؤمن کو قتل کیا—— یہ اس کی سزا ملی۔ (بحوالہ ہدایہ' ج ۴' ص ۲۲۵)

اُسامہ بن زید

اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے قبیلہ جہینہ کے ایک شخص کو قتل کر دیا' حالانکہ جب صحابہ کرامؓ اس پر حملہ آور ہوئے تو اس نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھا۔ کلمہ طیبہ سن کر سب حضرات ہٹ گئے مگر اُسامہ نے اسے قتل کر دیا۔

حضور ﷺ سے شکایت کی گئی تو اُسامہ نے کہا: اِنَّمَا کَانَ مُتَعَوِّذًا ۔ ''حضور! وہ تو جان بچانے کے لئے کلمہ پڑھ رہا تھا''۔ آپؐ نے فرمایا: ((اَفَلَا شَقَقْتَ عَنْ قَلْبِہٖ؟)) '' کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا؟'' پھر فرمایا: ((مَنْ لَکَ بِلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ؟)) ''قیامت کے دن لا الٰہ اِلا اللہ سے کون تجھے بچائے گا؟'' اُسامہ کہتے ہیں آپؐ نے تین دفعہ یہ وعید بیان فرمائی' اور میں نے اپنے دل میں کہا: کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا ـــ یعنی یہ فعل اسلام قبول کرنے سے پہلے کا ہوتا۔ (بخاری و مسلم)

مقداد بن اسود

ایک لڑائی میں حضرت مقداد سے بھی یہی غلطی ہو گئی تھی۔ حضور ﷺ نے مقداد سے جواب طلب کیا۔ مقداد نے یہی عذر کیا کہ وہ زبان سے اقرار کر رہا تھا' دل سے نہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

((فَکَیْفَ لَکَ بِلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ غَدًا؟))

''کل تیرا کیا حال ہوگا جب لا الٰہ الا اللہ خدا کی بارگاہ میں فریاد کرے گا؟''

پھر فرمایا: ''ایک شخص کفار کے خوف سے اپنا ایمان چھپاتا ہے' پھر تمہارے سامنے اس کا اظہار کرتا ہے اور تم اسے قتل کر دیتے ہو' یہی حال مکّہ میں تمہارا تھا''۔

خالدؓ بن ولید

خالدؓ بن ولید نے فتح مکّہ کے موقع پر بنی جذیمہ کے چند افراد کو قتل کر دیا۔ حضور ﷺ نے خالد اور ان کے ساتھیوں کو داعی بنا کر بھیجا تھا' حملہ آور بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ اس کے لئے الفاظ یوں ملتے ہیں: بعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خالد بن ولید حین افتتح مکّۃ داعیا ولم یبعثہ مقاتلاً۔ ان لوگوں نے صحابہ کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے صبانا' صبانا کہا' یعنی ہم کفر سے علیحدہ ہوئے۔ ان سے اسلمنا اسلمنا ''ہم نے اسلام قبول کیا'' کے الفاظ نہیں کہے گئے۔ مطلب ان کا یہی تھا' لیکن خالد بن ولید نے انکار سمجھ کر ان میں سے بعض کو قتل کر دیا۔ حضرت ابن عمرؓ نے ان سے اتفاق نہیں کیا اور قتل کرنے سے گریز کیا۔ حضور ﷺ کے علم میں جب یہ حادثہ

آیا تو آپؐ خوفزدہ ہو گئے اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر آپؐ نے فرمایا:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَبْرَأُ اِلَیْکَ مِمَّا صَنَعَ خَالِدٌ)) (صحیح البخاری)

''الٰہی! خالد نے جو کچھ کیا میں اس سے تیرے حضور میں اپنی براءت پیش کرتا ہوں''۔

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلا کر حکم دیا کہ مقتولوں کی دیت ادا کرو۔ حضرت علیؓ نے دیت ادا کی' یہاں تک کہ کتے کے پانی پینے کے برتن (میلغۃ الکلب) کی دیت بھی ادا فرمائی۔ (بحوالہ بدایہ' ج ۴' ص ۳۱۳)

مؤمن کی آبرو کی حفاظت

سورۂ حجرات میں دینی اور ایمانی اخوت کا اعلان کر کے اس کی اہمیت اور اس کے تقاضوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ﴾ صرف ایک دکھاوے کا نعرہ نہیں ہے' بلکہ یہ ایک حقیقی رشتۂ قلبی ہے اور اس کے اہم اخلاقی تقاضے ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ایمانی اخوت کے تقاضے کا اعلان ان لفظوں میں کیا:

((اِنَّ دِمَاءَ کُمْ وَاَمْوَالَکُمْ وَاَعْرَاضَکُمْ عَلَیْکُمْ حَرَامٌ کَحُرْمَۃِ یَوْمِکُمْ ھٰذَا فِیْ شَھْرِکُمْ ھٰذَا فِیْ بَلَدِکُمْ ھٰذَا)) (متفق علیہ)

ایک موقع پر آپ ﷺ نے ان الفاظ میں مؤمن کی عزت و آبرو اور اس کی جان و مال کے احترام کا اعلان فرمایا:

((کُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ حَرَامٌ مَالُہٗ وَعِرْضُہٗ وَدَمُہٗ)) (مسلم والترمذی)

مزید فرمایا:

((بِحَسْبِ امْرِیٍٔ مِنَ الشَّرِّ اَنْ یَحْقِرَ اَخَاہُ الْمُسْلِمَ)) (مسلم والترمذی)

''آدمی کے بدترین خلائق ہونے کے لئے یہ برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی بے عزتی کرے''۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے رسول اکرم ﷺ کے اس ارشادِ گرامی کو نقل کر

کے کعبۃ اللہ کی طرف خطاب فرمایا اور حضور ﷺ کے مشہور قولِ گرامی کی یاد دہانی کرائی۔ حضور ﷺ کی حدیث یہ ہے:

((یَا مَعْشَرَ مَنْ آمَنَ بِلِسَانِہٖ وَلَمْ یُفْضِ الْاِیْمَانُ اِلٰی قَلْبِہٖ لَا تَغْتَابُوا الْمُسْلِمِیْنَ وَلَا تَتَّبِعُوا عَوْرَاتِھِمْ فَاِنَّہٗ مَنْ یَتَّبِعُ عَوْرَاتِ الْمُسْلِمِیْنَ یَتَّبِعُ اللّٰہُ عَوْرَتَہٗ وَمَنْ یَتَّبِعُ اللّٰہُ عَوْرَتَہٗ یَفْضَحْہُ وَلَوْ فِیْ جَوْفِ رَحْلِہٖ)) (الترمذی)

''اے زبان سے ایمان لانے والے گروہ! جس کے دل میں ابھی تک ایمان داخل نہیں ہوا! اپنے مسلمان بھائیوں کی پیٹھ پیچھے برائی نہ کیا کرو اور نہ ان کے پیچھے ان کی کھوج میں لگا کرو۔ جو شخص مسلمانوں کا پیچھا کرتا ہے اور انہیں کریدنے کی حرکت کرتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کی کمزوریوں کا پیچھا کرتا ہے اور اللہ جس کے گناہوں کا پیچھا کرتا ہے وہ رسوا ہو جاتا ہے' اگرچہ اپنے کجاوے کے اندر بیٹھا ہوا ہو''۔

ابن عمرؓ نے اس کے بعد کعبہ پر نظر ڈالی اور یہ قولِ رسول دہرایا:

((مَا اَعْظَمَکِ وَاَعْظَمَ حُرْمَتَکِ وَالْمُؤْمِنُ اَعْظَمُ حُرْمَۃً عِنْدَ اللّٰہِ مِنْکِ))

''تو کتنا باعظمت ہے اور تیری حرمت کس قدر عظیم ہے! مگر اللہ کے نزدیک مؤمن کی حرمت تیری حرمت سے عظیم تر ہے''۔

حضور ﷺ کے اس ارشادِ گرامی میں سورۃ الحجرات کے تمام آداب و اخلاق کا خلاصہ آ گیا ہے۔

نہی عن المنکر اور اصلاحِ معاشرہ کی اہمیت اسلام میں واضح ہے' لیکن اس راہ میں بھی مؤمن کی عزت و آبرو کا لحاظ کتنا ضروری ہے' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چند واقعات اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تجسس

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک صاحب آتے جاتے تھے۔ چند روز وہ رک گئے' حضرت عمرؓ نے اپنے دوست عبدالرحمٰن بن عوف سے کہا کہ چلو اس شخص کی خبر لیں۔ یہ دونوں اس شخص کے مکان پر پہنچے' مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا' وہ شخص بیٹھا ہوا تھا اور ایک جوان عورت اسے برتن میں کچھ نکال نکال کر دے رہی تھی۔ حضرت عمرؓ نے یہ منظر دیکھ کر

کہا: ھذا الذی شغلہ عنا ''یہ ہے وہ شغل جس کی وجہ سے یہ شخص ہم سے دُور ہو گیا''۔ابن عوف نے کہا: ما یدریک ما فی الاناء ''آپ کو کیا خبر کہ اس برتن میں کیا ہے''۔حضرت عمرؓ کو فوراً احساس ہوا اور بولے: اتخاف ان یکون ھذا ھو التجسس؟ ''ابن عوف! کیا تمہیں اس بات کا خوف ہے کہ میرا یہ رویہ تجسس کے تحت آتا ہے؟'' ابن عوف بولے: بل ھو التجسس ''جی ہاں' یہ وہی تجسس (کھوج اور جستجو) ہے جس کی ممانعت قرآن کریم میں کی گئی ہے''۔حضرت عمرؓ نے فرمایا:

ما التوبۃ من ھذا؟ قال : لا تُعلِمْہُ بما اطلعتَ علیہ من امرہٖ ولا یکُونَنَّ فی نفسک الا خیرا (کنز العمال' ج۲' ص ۱٦۸)

''ابن عوف! اس گناہ کی توبہ کیا ہے؟'' ابن عوف نے کہا: ''جو دیکھا ہے اسے نقل نہ کیجئے گا اور اس شخص کے حق میں اپنے دل میں خیر کے سوا کچھ نہ رکھئے گا''۔

حضرت عمر ﷺ اس واقعہ کو نقل کرتے تو اس شخص کی طرف سے بدگمانیاں پھیلتیں اور یہ بات یقینی نہ تھی کہ وہ شخص شراب پی رہا تھا یا وہ عورت اجنبی تھی ـــــ ممکن تھا کہ وہ خاتون اس کی بیوی ہو اور وہ کوئی حلال مشروب اپنے شوہر کو پلا رہی ہو۔

ایک رات کو حضرت عمر ﷺ شہر کا گشت لگا رہے تھے کہ ایک مکان میں سے گانے بجانے کی آواز آئی' حضرت عمرؓ اس گھر کی دیوار پھاند کر داخل ہو گئے اور صاحب مکان پر غضبناک ہو کر بولے: یا عدوَّ اللّٰہ! اظننتَ انّ اللّٰہ یسترک وانت فی معصیۃ اللہ؟ فقال : وانت یا امیر المؤمنین لا تعجل علیَّ...... ''او دشمن خدا! کیا تو نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ تیری پردہ پوشی کرے گا جبکہ تو معصیت میں مبتلا ہو گا؟'' وہ بولا: امیر المؤمنین! آپ جلدی نہ کریں' اگر میں نے ایک گناہ کیا ہے تو آپؓ نے تین گناہ کئے ہیں: ایک گناہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: ﴿وَلَا تَجَسَّسُوا......﴾ ''جاسوسی نہ کرو''۔آپؓ نے جاسوسی کی۔ دوسرا گناہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: ﴿وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا﴾ ''گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہو''۔آپؓ دیوار پھاند کر اندر آئے۔ تیسرا گناہ یہ کہ خدا نے حکم دیا: ﴿لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی

تَسْتَأْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰى اَهْلِهَا ﴾ ''دوسروں کے گھروں میں داخل مت ہو یہاں تک کہ اجازت لے لو اور گھر والوں کو سلام کرلو''۔ لیکن آپؓ میری اجازت کے بغیر داخل ہوئے۔ حضرت عمرؓ اس کا جواب سن کر حیران رہ گئے اور فرمایا: **فھل عندک من خیر ان عفوتُ عنک ؟** ''اگر میں تجھے معاف کردوں تو کیا تیرے پاس میرے لئے بھلائی ہے؟'' اس نے کہا: ہاں' بھلائی ہے۔ آپؓ نے اسے معاف کردیا اور وہاں سے تشریف لے گئے۔ (ایضاً)

بوڑھے شرابی کا واقعہ

ایک رات حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ شہر کا گشت لگا رہے تھے کہ ایک مکان میں روشنی نظر آئی' یہ دونوں حضرات اس مکان میں داخل ہو گئے اور دیکھا ایک بوڑھا بیٹھا ہے' اس کے سامنے شراب رکھی ہے اور ایک کنیز گا رہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: **ما رایتُ کاللیلة منظرا اقبح من شیخ ینتظر اجله** ''میں نے آج سے زیادہ برا منظر کبھی نہیں دیکھا' اس بوڑھے کا جس کا موت انتظار کر رہی ہے''۔ وہ بوڑھا بولا: **بلٰی ' یا امیر المؤمنین! ما صنعتَ انتَ اقبحُ** ''ہاں' اے امیر المؤمنین! مگر جو کچھ آپؓ نے کیا وہ اس سے زیادہ برا ہے''۔ **تجسَّستَ وقد نُھِیَ عن التجسس ودخلتَ بغیر اذن** ''آپؓ نے ٹوہ لگائی اور بغیر اجازت مکان میں داخل ہوئے' حالانکہ ان دونوں باتوں سے روکا گیا ہے''۔ حضرت عمرؓ یہ کہتے ہوئے باہر آ گئے: **صدقتَ** ''تو نے سچ کہا''۔ آپؓ کی حالت یہ تھی: **ثم خرج عاضا علی ثوبه یبکی وقال ثکلت عمر امه ان لم یغفر له ربه** ''حضرت عمرؓ دانتوں سے کپڑا چباتے ہوئے (جو اظہارِ افسوس میں ہوتا ہے) باہر آ گئے اور کہا: ''اگر خدا نے عمر کو معاف نہ کیا تو عمر کی ماں عمر کو روئے''۔

اس بوڑھے نے اس واقعہ کے بعد توبہ کر لی مگر وہ حضرت عمرؓ کے سامنے نہیں آیا کرتے تھے۔ عرصہ کے بعد کسی مجلس میں یہ شیخ کنارہ پر بیٹھ گئے' حضرت عمرؓ نے پہچان لیا اور اپنے پاس بلایا۔ وہ ڈرتے ڈرتے آئے' آپؓ نے قریب بلا کر ان کے کان میں کہا:

والذی بعث محمدًا بالحق رسولاً ما اخبرتُ احداً من الناس بما رایتُ منک ولا ابنُ مسعود فانه کان معی

''قسم ہے اُس ذات کی جس نے حضرت محمد ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا! میں نے اس واقعہ کی کسی کو اطلاع نہیں دی اور نہ میرے ساتھی ابن مسعودؓ نے دی''۔

اس بوڑھے نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کان میں یہ بات کہی:

والذی بعث محمدًا بالحق رسولاً ما عدتُ الیه حتی جلستُ مجلسی هذا

''خدا کی قسم! میں نے اس کے بعد آج تک وہ گناہ نہیں کیا''۔

فرفع عمر صوته یکبر ' فما یدری الناس من ای شیء یکبر

(بحوالہ کنز' ج ۲' ص ۱۴۱)

''حضرت عمرؓ نے خوشی کے مارے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور اہل مجلس کو پتہ نہ چلا کہ عمر نے اللہ اکبر کا نعرہ کیوں بلند کیا۔''

نہی عن المنکر اور اصلاح کے لئے کتنے اخلاص کی' کتنے جذبۂ خیر خواہی کی اور مؤمن کی عزت نفس کے احترام کی کتنی ضرورت ہے؟ اور پھر اس اصلاحی قدم میں کتنا اثر ہوتا ہے' اس کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔ (حیاتِ صحابہ' ج ۲' ص ۴۲۰)

مؤمن کو پریشان کرنا

ابوالحسن بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کی مجلس سے ایک شخص باہر جانے کے لئے کھڑا ہوا' اس شخص کی جوتی ایک صاحب نے چھپا دی' وہ پریشان ہو گیا۔ وہ کہتا تھا: ''میری جوتیاں' میری جوتیاں!'' لوگ کہتے: ہم نے نہیں دیکھیں۔ وہ کہتا: ''وہ یہیں تھیں' اسی جگہ تھیں''۔ آپ ﷺ نے دیکھ کر فرمایا: ((فَکَیْفَ بِرَوْعَةِ الْمُؤْمِنِ؟)) ''یہ مؤمن کو پریشان کرنا کیوں؟'' ایک صاحب بولے: یارسول اللّٰه انما صنعتُه لاعباً'' حضور ﷺ! میں نے تو مذاق کیا تھا''۔ آپؐ نے فرمایا: ((لَا تَرَوِّعُوا الْمُسْلِمَ فَاِنَّ رَوْعَةَ الْمُسْلِمِ ظُلْمٌ عَظِیْمٌ)) ''مؤمن کو پریشان نہ کیا کرو' یہ ظلم عظیم ہے''۔

سلیمان بن حسرد کا بیان ہے کہ ہم حضور ﷺ کے ساتھ نماز ادا کر رہے تھے کہ

ایک دیہاتی آیا اور وہ بھی نماز میں شریک ہو گیا۔ اس دیہاتی کے پاس چمڑے کا ایک ترکش (قرن) تھا' اسے کچھ لوگوں نے غائب کر دیا۔ دیہاتی پریشان ہو گیا اور **القرن**' **القرن** پکارنے لگا۔ وہ لوگ ہنسنے لگے اور اس کا تھیلا دے دیا۔ یعنی اس کے ساتھ مذاق کیا گیا تھا۔ آپ ﷺ نے اس تکلیف دہ مذاق کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

((مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا يَرُوْعَنَّ مُسْلِمًا))

''جو اللہ اور آخرت پر یقین رکھتا ہو وہ کسی مسلمان کو پریشان نہ کرے''۔

(حیات صحابہ' ج ۲' ص ۴۰۹)

حضرت اُسامہ بن زید سے محبت

اوپر حضرت اُسامہؓ پر حضور ﷺ کی ناراضگی کا واقعہ نقل کیا گیا۔ حضور ﷺ کو اُسامہ سے کس قدر محبت تھی' اس پر غور کرو۔ رسول اکرم ﷺ کو اپنے محبوب خادم حضرت زید کے صاحبزادے اُسامہ سے بڑی محبت تھی —— حسن و حسین (رضی اللہ عنہما) تو آپؐ کا خون تھے' لیکن اُسامہ سے تو آپؐ کا کوئی خونی رشتہ نہ تھا' پھر آپؐ نے اُسامہ کو کس قدر محبت عطا فرمائی!

(۱) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مدینہ منورہ آ کر اُسامہ کو چیچک ہو گئی۔ اُسامہ ایک کم سن بچے تھے جن کے مُنہ سے رال ٹپکتی تھی اور میں ان سے گھن کھاتی تھی' مگر رسول اکرم ﷺ کا حال یہ تھا کہ **فَطَفِقَ يَغْسِلُ وَجْهَهُ وَيُقَبِّلُهُ**..... ''اُسامہ کا مُنہ دھوتے تھے اور اس کے بوسے لیتے تھے''۔ فرماتی ہیں: **اما واللّٰه' بعد هذا فلا اقصيه ابدًا**..... اللہ کی قسم! اس منظر کو دیکھنے کے بعد میں نے اُسامہ کو حقارت سے دیکھنا چھوڑ دیا۔

(۲) ایک روز اُسامہ مکان کی چوکھٹ پر گر پڑے اور ان کی پیشانی زخمی ہو گئی' حضور ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو آواز دی: ((**يَا عَائِشَةُ! اَمِيْطِيْ عَنْهُ الدَّمَ**)) ''عائشہ! اُسامہ کا خون صاف کر دے'' **فَتَقَذَّرْتُهُ** ''لیکن میں نے اس سے کراہت کی''۔

فَجَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَمُصُّ شَجَّتَهٗ وَيَمُجُّهٗ وَيَقُوْلُ: ((لَوْ كَانَ اُسَامَةُ جَارِيَةً لَكَسَوْتُهٗ وَحَلَّيْتُهٗ حَتّٰى اُنْفِقَهٗ)) (ابن ماجه)

''تو رسول اللہ ﷺ نے اُسامہ کے زخم سے خون چوسا اور تھوک دیا اور (اُسامہ کی دل داری کے طور پر) فرمایا: ''اُسامہ اگر لڑکی ہوتا تو میں اسے اچھے کپڑے پہناتا اور زیور پہناتا' یہاں تک کہ اس کی شادی کر دیتا''۔

(۳) حجۃ الوداع میں حضور ﷺ کو عرفات سے چلنے میں کچھ دیر ہو گئی' آپؐ اُسامہ کا انتظار کر رہے تھے۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک لڑکا چپٹی ناک والا سیاہ فام آپ ﷺ کے پاس آیا (فجاء غلامٌ اَفْطَسَ اَسْوَدَ) اور آپؐ روانہ ہو گئے۔

یمن کے آدمیوں نے اس تاخیر پر حضور ﷺ کو طنز کرتے ہوئے کہا:

اِنَّمَا حَبَسَنَا من اجل هذا؟

''کیا اس لڑکے کی وجہ سے ہمیں روکے رکھا؟''

اس واقعہ کے راوی حضرت عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس گستاخی کی نحوست ان لوگوں پر ایسی پڑی کہ یہ لوگ وصالِ نبویؐ کے بعد مرتد ہو گئے اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو انہیں راہِ راست پر لانے کے لئے جہاد کرنا پڑا۔

(حیاتِ صحابہؓ ج ۲' ص ۴۱۱)

بقیہ: شرابِ کہن پھر پلا ساقیا

کہ یہ تحریکیں کبھی آمر جنرلوں کا دم بھرتی ہیں تو کبھی بحالی جمہوریت کی تحاریک کو جہاد قرار دیتی ہیں۔ انتخابات ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے' بلکہ ہر وہ کام ان کے لئے جائز و طیب بلکہ مستحسن ہے جس سے ان کے خیال میں اسلامی نظام کے لئے راہ ہموار ہوتی ہے۔ چنانچہ بڑی برائی کے مقابلے میں چھوٹی برائی کو گلے لگانا بلکہ چومنا چاٹنا ان کا محبوب فلسفہ ہے۔

(جاری ہے)

انسانیت کا نجات دہندہ ﷺ غیروں کی نظر میں

مرتب: حافظ عبدالمنان اعوان

تاریخ عالم شاہد ہے کہ روئے ارضی پر آنحضور ﷺ کے سوا کوئی انسان ایسا پیدا نہیں ہوا جس نے خود اپنی ہی زندگی کو اپنے دعوے کی صداقت کے لئے بطورِ دلیل پیش کیا ہو۔ یہ بڑا ہی مشکل بلکہ ناممکن کام ہے کہ کوئی مصلح، قائد یا پیشوا ایسی جرأت کر سکے اور اپنی ہی زندگی کو اپنے دعوے کی صداقت کے لئے بطورِ دلیل پیش کر سکے۔ آپ زندگی کے کسی دور میں ہوں اور آپ کو جس کسی مرحلہ میں صحیح اور بہترین عملی نمونۂ حیات کی ضرورت محسوس ہو، آپ پیغمبر اسلام محمد ﷺ ہی کو اپنے لئے بہترین راہنما اور کامل ترین معلّم پائیں گے۔

آنحضرت ﷺ بہترین اخلاق و اوصاف کے مالک تھے۔ ان کا کردار بنی نوعِ انسان کے لئے بہترین نمونہ تھا جسے قرآن نے اُسوۂ حسنہ کا نام دیا ہے۔ ہر آدمی میں کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے اور کبھی نہ کبھی اس سے کوئی ایسا قول یا فعل سرزد ہوتا ہے جس کو خود اس کی نظر بھی قابل گرفت قرار دیتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے علاوہ دنیا میں کبھی کوئی آدمی ایسا پیدا نہیں ہوا جس کو خود اپنے بعض اقوال و اعمال میں عیب یا کم از کم ناپسندیدگی کا کوئی پہلو نظر نہ آتا ہو۔ یہ تو آنحضرت ﷺ کی زندگی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مکمل ترین نمونہ کردار بنا کر بھیجا تھا۔

آیئے آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور خلق عظیم کی ایک جھلک دنیائے کفر کے چند مؤرخین و فاتحین و مصنفین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

نپولین بوناپارٹ محسنِ انسانیت آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہے:

''محمد (ﷺ) کی ذات ایک مرکز ثقل تھی جس کی طرف لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ اُن (ﷺ) کی تعلیمات نے لوگوں کو اپنا مطیع و گرویدہ بنا لیا اور ایک گروہ پیدا ہو گیا جس نے چند ہی سال میں اسلام کا غلغلہ دنیا میں بلند کر دیا۔ اسلام کے اِن پیروؤں نے دنیا کو جھوٹے خداؤں سے چھڑا لیا۔ انہوں نے بُت سرنگوں کر دیئے۔ موسیٰ و عیسیٰ (علیہما السلام) کے پیروؤں نے پندرہ سو سال میں کفر کی نشانیاں اتنی منہدم نہ کی تھیں جتنی اِن متبعین اسلام نے صرف پندرہ سال میں کر دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد (ﷺ) کی ہستی بہت ہی بڑی تھی۔''(۱)

مشہور یورپین محقق لین پول رقم طراز ہے:

''محمد (ﷺ) نہایت با اخلاق اور رحم دل بزرگ تھے۔ اُنؐ کی بے ریا خدا پرستی، عظیم فیاضی مستحق تعریف ہے۔ آپؐ اس قدر انکسار پسند تھے کہ بیماروں کی عیادت کو جایا کرتے تھے، غلاموں کی دعوت قبول کر لیتے، غریبوں سے زیادہ محبت کرتے اور اپنے کام خود اپنے ہاتھ سے انجام دیتے تھے۔ بے شک آپؐ مقدس پیغمبر تھے''۔ (قرآن کوئز)

ڈاکٹر مسز اینی بیسنٹ نے اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا:

''جہاں تک اسلام کے بانی کا تعلق ہے، آپؐ کی زندگی کی تاریخ میں علم الاصنام کا وہ عنصر نہیں پایا جاتا جس نے دوسرے بڑے مذہبی پیشواؤں کی زندگیوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ آپؐ کی زندگی ایک ایسے زمانے میں بسر ہوئی تھی جسے تاریخی زمانہ کہا جاتا ہے — آپؐ کی زندگی اپنے خدّ و خال کے اعتبار سے کس قدر سادہ، کس قدر بہادرانہ تھی! آپؐ تاریخ کے ایک کٹھن دَور میں پیدا ہوئے تھے جو سخت اور مشکل حالات سے گھرا ہوا تھا۔ آپؐ ایک ایسی قوم میں پیدا ہوئے تھے جو سرتاپا اوہام پرستی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

ہمیں آپؐ کی زندگی اِس قدر شریفانہ اور اِس قدر سچی نظر آتی ہے کہ ہم فوراً معلوم کر لیتے ہیں کہ کیوں آپؐ کو اپنے گرد و پیش کے لوگوں تک اپنے خدا کا پیغام پہنچانے کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ مکّہ کے تمام مَرد، عورتیں اور بچے آپؐ کو الامین کے نام سے پکارا کرتے تھے، یعنی صادق، دیانت دار۔ مجھے اِس سے زیادہ پائے کا اور زیادہ شریفانہ اور کوئی لقب نہیں ملتا جس سے وہ آپؐ کو پکارا کرتے تھے۔''(۲)

مسٹر گبن لکھتے ہیں:

''ہر انصاف پسند شخص یہ یقین کرنے پر مجبور ہے کہ محمد (ﷺ) کی تبلیغ و ہدایت خالص سچائی اور خیر خواہی پر مبنی تھی۔'' (قرآن کوئز)

پنڈت گوپال کرشن آنحضرت ﷺ کی سیرتِ طیبہ یوں بیان کرتے ہیں:

''رشی محمد (ﷺ) کی زندگی پر جب ہم وچار کرتے ہیں تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ ایشور نے اُنؐ کو سنسار سدھارنے کے لئے بھیجا تھا۔ اُنؐ کے اندر وہ شکتی (قوت) موجود تھی جو ایک گریٹ ریفارمر (مصلح اعظم) اور ایک مہاپُرش (ہستیٔ اعظم) میں ہونی چاہئے۔ وہ عرب کے فاتح اعظم تھے مگر مفتوح اقوام کے لئے پیغامِ رحم و کرم تھے۔ آپؐ کی تعلیم میں ایک چمکتا ہوا ستارہ یہ بھی ہے کہ وہ امیر و غریب کو ایک ہی سطح پر زندگی بسر کرنے کا ڈھب سکھلاتے تھے۔ آپؐ کا قول تھا کہ غریب کے پہلو میں بھی دل ہے جو اچھے سلوک سے خوش اور بُرے سلوک سے ناخوش ہوتا ہے۔''(۳)

مشہور روسی محقق کاؤنٹ طالسطائی رقم طراز ہے:

''حضرت محمد (ﷺ) دُنیا میں مصلح عظیم بن کر آئے تھے اور آپؐ میں ایسی برگزیدہ قوت پائی جاتی تھی جو کہ قوّت بشری سے بہت زیادہ ارفع و اعلیٰ تھی''۔ (قرآن کوئز)

جارج برناڈ شا لکھتا ہے:

''ازمنۂ وسطیٰ میں عیسائی راہبوں نے اپنی جہالت اور تعصب کی وجہ سے مذہب اسلام کی بڑی بھیانک تصویر پیش کی ہے۔ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی' انہوں نے حضرت محمد (ﷺ) اور آپؐ کے مذہب کے خلاف باضابطہ تحریک چلائی۔ میں نے ان باتوں کا بغور مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے اور میں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ محمد (ﷺ) ہستیٔ عظیم تھے اور صحیح معنوں میں انسانیت کے نجات دہندہ''۔ (قرآن کوئز)

حواشی

(۱) بوناپارٹ اور اسلام' از شیفلر' پیرس فرانس' ص ۱۰۵۔

(۲) ۱۹۱۲ء میں ایک تصوف کانفرنس میں حضورِ مقبول ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر ایک تقریر۔

(۳) بھارت سماچار ''مہاپُرش'' کے عنوان سے ایک مضمون سے اقتباس۔

فکر اسلامی کا عظیم سرمایہ (۵)

ایک مطالعاتی جائزہ

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کی تحریروں سے اقتباسات

مرتب: محمد موسیٰ بھٹو

انسانی سرگرمیوں کی قوت محرکہ سے ناآشنا دانشوروں کو فلسفہ پیش کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں

گویا انسانی سرگرمیوں (خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی) کی نوعیت اور ان کی غرض و غایت کو اس وقت تک سمجھنا ناممکن ہے جب تک ہم انسانی شخصیت کی بگھی کو ہانکنے والے ڈرائیور کی حقیقت اور اس کے نصب العین یا منزلِ مقصود سے آگاہ نہ ہوں۔ دوسرے الفاظ میں تاریخ، سیاسیات، اخلاقیات، تعلیمات، قانون، معاشیات، مذہب، فن، سائنس اور جنگ کے فلسفہ پر کسی مصنف کو اس وقت تک طبع آزمائی کرنے اور دوسروں کے سامنے اپنا فلسفہ پیش کرنے کا کوئی حق نہیں جب تک اس کے فلسفہ کی بنیاد اس جبلت پر نہ ہو جو انسانی سرگرمیوں کی قوتِ محرکہ ہے۔ اس خواہش کی نوعیت کے بارے میں اس کا علم ناقص اور منطق و عقلیت کے معیار سے فروتر ہو سکتا ہے، لیکن اگر کوئی صاحبِ قلم اس جبلت سے کلیتاً صرفِ نظر کر کے اپنا فلسفہ پیش کرے گا تو وہ فلسفہ کی ابتدائی شرطوں پر بھی پورا نہیں اترے گا اور نہ اہل دانش کے نزدیک کسی غور و فکر کا مستحق ہوگا۔ ایسے مصنف کا ذہن آغاز سے ہی پراگندہ ہوگا، اس لئے وہ جن نتائج تک پہنچے گا وہ عقل و خرد سے عاری اور شیخ چلی کی قیاس آرائیوں کے مترادف ہوں گے۔

(مضمون: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ماہانہ اسلامی تعلیم، نومبر و دسمبر ۱۹۷۳ء)

اسلام کی حکیمانہ سائنسی توجیہہ مہیا کرنا' مسلمانوں کی حیاتیاتی ضرورت ہے

مَیں پھر اس بات کا اعادہ کرتا ہوں کہ اسلام کی حکیمانہ اور سائنسی توجیہہ مہیا کرنا مسلمانوں کی ایک حیاتیاتی ضرورت ہے' جس کو وہ صرف اپنی زندگی کی قیمت پر ادا کر کے ہی نظر انداز کر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حملہ یا جارحانہ اقدام بہترین مدافعت ہے۔ یہ حقیقت جس طرح اس جنگ کی صورت میں درست ہے جو ایک ریاست کو فوجی محاذ پر لڑنی پڑتی ہے' اسی طرح سے اس جنگ کی صورت میں بھی درست ہے جو اس کو نظریاتی محاذ پر لڑنی ہوتی ہے۔ اگر ہم بروقت اور اس سے پہلے کہ پانی سر سے گزر جائے' اسلام کی مدافعت کے لئے دوسرے نظریات کے علمی اور نظریاتی جہاد کا محاذ کھول سکیں تو ممکن ہے کہ پھر اسلام کی مدافعت کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہے اور ہم دیکھیں کہ جس نظریۂ حیات کی مدافعت کے لئے ہم آخر کار باہر نکل رہے ہیں وہ وہ نہیں جس کی مدافعت کے لئے ہمیں کل تک باہر نکلنے کے لئے کہا جاتا تھا۔ لیکن جب تک ہم اس طریق پر جس کی نشاندہی اوپر کی گئی ہے' اسلام کی حکیمانہ اور سائنسی توجیہہ پیدا نہ کریں ہم اس وقت تک علمی اور نظریاتی جہاد کا محاذ نہیں کھول سکتے۔ کام کی فوری ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر ہمیں اپنے بہترین اور سب سے زیادہ زوردار دماغوں کو اس کام پر لگانا چاہئے' تاکہ یہ جلد از جلد اپنی تکمیل کے مرحلے طے کرے۔ ہمیں چاہئے کہ ہر پائی جو میسر آ سکتی ہے' اس کام پر لگا دیں اور جو لوگ اس کام میں لگ جائیں وہ جب تک کام ختم نہ ہو جائے پوری تن دہی کے ساتھ اسی کام میں مصروف رہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں مستشرقی تحقیق اور میکانکی اسلامی تحقیق کے کاموں کو کلیتاً بند کرنا چاہئے' لیکن ہمیں یقیناً مستشرقی تحقیق کے کام کو خواہ ہم آئندہ اس کو کسی نام کے ساتھ جاری رکھنا پسند کریں' یونیورسٹیوں تک محدود کر دینا چاہئے' تاکہ اسلامی تحقیق کے غلط اور فریب کارانہ لقب کے ساتھ' جو درحقیقت حیلہ ساز عیسائیت نواز مستشرقی ذہنوں کی پیداوار ہے' وہ ہمارے اسلامی تحقیق کے اداروں میں دخل انداز نہ ہو سکے۔

(اسلامی تحقیق کا مفہوم' مدعا اور طریق کار' صفحہ ۳۰' تصنیف ڈاکٹر محمد رفیع الدین)

بعض وقت کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی فوری اور شدید ضرورت یہ ہے کہ اسلام کے جدید قانونی نظام کی تشکیل کی جائے۔ لیکن جب تک ہم اسلام کو ٹھیک طرح سے اور پوری طرح سے نہ سمجھ لیں ہم اسلام کے جدید قانونی نظام کی تشکیل کیسے کر سکتے ہیں! اس وقت ٹھیٹھ اسلام ہی کی مختلف توجیہات کی جا رہی ہیں' لہٰذا ہمیں پہلے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کون سا اسلام ہے جس سے ہم نے ایک نیا قانونی نظام اخذ کرنا ہے۔ جب اسلام کی حکمیاتی اور سائنسی توجیہہ جو صرف ایک ہی ہو سکتی ہے' موجود ہو جائے گی تو پھر وہ نہ صرف غیر مسلموں کے تمام غلط نظریات اور فلسفوں کی مکمل اور ایمان پرور تردید کرے گی بلکہ اسلام کی ان غلط اور بے بنیاد توجیہات کا بھی مکمل اور یقین افروز ابطال کرے گی جو اُن مسلمانوں نے پیش کی ہیں جو اسلام کے جدیدیت زدہ' کوتاہ اندیش مسلمان نکتہ چینوں کو مطمئن کرنے کے لئے اسلام کو ایک نئی شکل دینا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اسلام کی حکمیاتی اور سائنسی توجیہہ فقط ایک ہی بنیاد ہے جس پر ہم اسلام کے جدید قانونی نظام کی عمارت کھڑی کر سکتے ہیں۔ اور اصل بات یہ ہے کہ جب اسلام کی ایسی توجیہہ فی الواقع وجود میں آئے گی تو ہم دیکھیں گے کہ احکامِ اسلامی کی علتوں اور حکمتوں کے کھل جانے کی وجہ سے اسلام کے جدید قانونی نظام کی تشکیل کے بہت سے مشکل مسائل خود بخود حل ہو گئے ہیں اور اس کا سارا کام نہایت آسان ہو گیا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۳۱)

یقین کے فقدان کے دَور میں اسلام کے قانونی نظام کی تشکیلِ جدید کا نعرہ۔ بے وقت کی راگنی

مسلمانوں کی زندگی کے اس مرحلہ پر جب اسلام پر ان کا یقین گر رہا ہے' اسلام کے قانونی نظام کی تشکیل جدید ایک بے وقت کی کوشش اور ایک بہت بڑی غلطی ہو گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اسلام کے موجودہ قوانین بہتر نہیں' بلکہ بدتر ہو جائیں گے۔ مجتہد کو جو چیز صحیح اجتہاد کے راستہ پر راہنمائی کرتی ہے وہ علومِ قدیمہ و جدیدہ کا علم ہی نہیں' بلکہ خدا کی محبت اور معرفت کا نور بھی ہے۔ انحطاطِ دین کے اس زمانہ میں یہ نور نایاب نہیں

تو صعب و مشکل ہے۔ اس سے پہلے کہ کسی مسلمان کے دل میں یہ نور پوری طرح سے روشن ہو' نہ صرف یہ ضروری ہے کہ وہ عرصۂ دراز تک قرآن اور حدیث کے گہرے مطالعہ میں لگا رہے اور صحابہ اور ائمہ اور صلحاء کی پاکیزہ اور مجاہدانہ زندگیوں سے اثر پذیر ہو' بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح سے اسلام کے اخلاقی اور مذہبی ضبط کے ماتحت رکھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت اسلام کے معاشرتی قوانین کو بدلنے کی فوری ضرورت ہے' لیکن جب تک ہم اسلام کے اخلاقی اور مذہبی قوانین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اس وقت تک ہم اسلام کے معاشرتی قوانین کی بھی کوئی عزت نہیں کر سکتے اور اس وقت تک ٹھیک طرح سے یہ بھی نہیں جان سکتے کہ ہمیں اسلام کے معاشرتی قوانین کو کس طرح بدلنا چاہئے اور آیا ان کو بدلنے کی ضرورت بھی ہے یا نہیں۔ ایسی حالت میں ہم اسلام کے معاشرتی قوانین کو کم از کم اسلام کے ان اخلاقی اور مذہبی قوانین کی روشنی میں نہیں بدل سکتے' جن کی خلاف ورزی ہم دن رات کرتے ہیں۔ (ایضاً' صفحہ ۳۲)

اجتہاد کی موجودہ خواہش غیر اسلامی نظریات سے محبت کا نتیجہ ہے

سچا اجتہاد ہمیشہ اسلام کی گہری محبت کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس محبت کی وجہ سے وہ اس شریعت کی ایک قدرتی اور بے ساختہ نشوونما کی صورت اختیار کرتا ہے جو حضور ﷺ اور صحابہؓ نے ہمارے لئے چھوڑی ہے۔ اجتہاد کے لئے ہماری موجودہ خواہش اسلام کی محبت کا نتیجہ نہیں' بلکہ اسلام کی پوشیدہ نفرت اور غیر اسلامی نظریات کی چھپی ہوئی محبت اور ستائش کا نتیجہ ہے۔ اس کا مقصد درحقیقت یہ ہے کہ اسلام کے احکام کو اس طرح سے بدل دیا جائے کہ وہ ہمارے ان خیالات اور تصورات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں جو ہم نے غیر اسلامی نظریات سے مستعار لئے ہیں اور جن کو ہم دل ہی دل میں چاہتے اور بنظر استحسان دیکھتے ہیں۔ یہ خواہش دراصل اس بات کی ایک کوشش ہے کہ اسلام کو اس ''حکمت'' اور ''دانائی'' سے بہرہ ور کیا جائے جو ہم نے دوسرے نظریات سے سیکھی ہے اور اس طرح سے اسلام کو ایک نئے ''حسن و جمال'' سے اور ایک نئی ''شان و شوکت''

سے جن کا نظارہ ہم ان نظریات کی قیادت میں کر چکے ہیں' ''مزین'' کیا جائے۔ یہ سچا اجتہاد نہیں' کیونکہ یہ وہ اجتہاد نہیں' جو شریعت کی قدرتی اور بے ساختہ نشوونما کی صورت اختیار کرتا ہے' بلکہ یہ شریعت کی تحریف ہے جو ہم اپنے توہمات کے زیر اثر کرنا چاہتے ہیں یا ایک ایسی کوشش ہے جس سے ہم دوسرے نظریات کو جنہیں ہم پسند کرتے ہیں' جہاں تک ہمارا بس چلتا ہے اسلام کا مقام دینا چاہتے ہیں۔ سچا اجتہاد اس وقت ممکن ہوگا جب ہم اسلام سے پھر ایسی ہی محبت کا احساس کرنے لگیں گے جیسی کہ پہلے ہمارے دلوں میں تھی اور ہم اس شریعت کو جس پر حضور ﷺ اور صحابہؓ کا عمل تھا' پھر ایسی ہی محبت کی روشنی میں پوری طرح سے سمجھنے لگیں گے۔ جب تک ہمیں اسلام کی محبت کا یہ مقام پھر حاصل نہیں ہو جاتا ہم اسلام کی اس بصیرت سے محروم رہیں گے جس کی مدد سے ہم یہ سمجھنے کے قابل ہو سکتے ہیں کہ ہمارے معاشرہ میں جو تغیر واقع ہوا ہے وہ اس بات کا مقتضی ہے یا نہیں کہ ہم شریعت کی روشنی میں اس کی اصلاح کے لئے نئے قوانین وضع کریں۔ اگر حضرت عمرؓ کو یہ بصیرت حاصل تھی تو اس سے یہ کہاں ثابت ہو جاتا ہے کہ عام بے یقینی کے اس دَور میں یہ بصیرت ہمیں بھی حاصل ہے۔ (ایضاً صفحہ ۳۳' ۳۴)

انحطاط کے دَور میں متقدمین کی تحقیق کی اہمیت

جس چیز کو ہم معاشرہ کا ایک ناگزیر ارتقائی تغیر سمجھ رہے ہیں' جو ہمارے خیال میں اجتہاد اور نئے قوانین کا تقاضا کرتا ہے' وہ درحقیقت مغرب کی تقلید میں ہماری عام اخلاقی گراوٹ' غیر اسلامی نظریات سے ہماری محبت اور اسلام کے اخلاقی اور دینی ضبط اور نظم سے ہماری نفرت اور بغاوت کے عوامل ہیں' جو ایک دوسرے پر عمل اور ردعمل کر رہے ہیں۔ یہ تمام حالات اسلام پر ہمارے یقین کے انحطاط کی علامات کے سوائے اور کچھ بھی نہیں۔ موجودصورت میں ہمارا اجتہاد جو باطل ہوگا' ان افسوس ناک حالات کو بہتر نہیں' بلکہ بدتر بنائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اجتہاد شریعت کے وقار کو اور اس کے ساتھ پورے عالم اسلام کے وقار کو اور کم کرے گا' جس سے ہمارا یقین اور متزلزل ہو جائے گا اور ہم میں سے بعض لوگ جن کا ایمان پہلے ہی کمزور ہے' ناحق اور ناروا طور پر

یہ سمجھنے لگیں گے کہ اسلام ایک وقتی نظریۂ حیات تھا جو حالات کے ساتھ بدل گیا ہے۔ لیکن اسلام کی ساری تاریخ بتا رہی ہے کہ ایسے اجتہاد کو سچے مسلمانوں نے کبھی قبول نہیں کیا اور اس کے باوجود سچا اسلام ہمیشہ زندہ اور باقی رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اقبال نے کہا ہے کہ یقین و ایمان کے انحطاط کے اس دَور میں متقدمین کے قدم پر چلنا اس سے بدرجہا بہتر اور محفوظ تر ہے کہ ایسے لوگوں کا اجتہاد قبول کیا جائے جو نورِ ایمان سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان حالات کا صحیح علاج یہ نہیں کہ ہم نئے قوانین وضع کریں جو ہمارے اعمال و افعال کو زیادہ سے زیادہ مصنوعی اور سطحی طور پر بدل سکتے ہیں' بلکہ ان کا صحیح علاج یہ ہے کہ ہم اسلام کے جدید نظامِ تعلیم کو نافذ کریں جس میں خدا کا تصور تمام طبیعیاتی' حیاتیاتی اور نفسیاتی یا انسانی اور اجتماعی علوم کو منظّم کرنے والا محوری اور مرکزی تصور ہو۔ صرف ایسا نظامِ تعلیم ہی فرد کو ذہنی طور پر پوری طرح سے بدل کر درست کر سکتا ہے۔ یہ نہ تو کوئی دیانت داری ہے اور نہ انصاف کہ ہم پہلے خود ہی ایک ایسا تعلیمی اور ثقافتی ماحول پیدا کریں جس میں فرد کی ذہنی اور نفسیاتی تربیت صرف اس طرح سے ہو سکے کہ وہ اسلام کے نقطۂ نظر سے سوچنے اور کام کرنے کے قابل نہ رہے اور پھر یہ شکایت کریں کہ اس کے اعمال و افکار درست نہیں اور ایسے قوانین وضع کریں جو اس کے نادرست اعمال میں ایک بیرونی مصنوعی دباؤ کی صورت میں رکاوٹ پیدا کریں۔ قوانین صرف وہاں کام کرنے کے لئے وضع کئے جاتے ہیں جہاں تعلیم ناکام رہ گئی۔ ہمارے لئے اس بات کا کوئی جواز موجود نہیں کہ ہم تعلیم کی دلوں کو بدلنے والی اصلی قوت کو آزمائے بغیر قوانین کی مصنوعی قوت سے کام لیں جو ہمارے ظاہری اعمال کو بھی بدل نہیں سکتی۔ تعجب کا مقام ہے کہ ہم معاشرہ کو جدید اسلامی نظامِ تعلیم کے ذریعہ سے حقیقی معنوں میں اور بنیادی طور پر بدلنے کی بجائے اسے مصنوعی اور سطحی طور پر بدلنے کے لئے موجودہ اسلامی قوانین کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں' حالانکہ ہمیں خوب معلوم ہے کہ جب قوانین پر عمل کرنے کی نیت موجود نہ ہو تو ان کی زد سے بچ کر نہایت آسانی کے ساتھ ان کی خلاف ورزیاں کی جا سکتی ہیں۔ (اسلامی تحقیق کا مفہوم' مدعا اور طریق کار' صفحہ ۳۴)

نظریاتی جنگ میں فتح یابی کے لئے صحیح فلسفۂ تعلیم کی تشکیل کی ضرورت

لیکن جدید اسلامی نظامِ تعلیم جو نہ صرف اسلامی ہونا چاہئے' بلکہ علمی اور عقلی لحاظ سے بھی محکم اور غیر متزلزل بنیادوں پر قائم ہونا چاہئے' اس بات پر موقوف ہے کہ آیا ہم تعلیم کا کوئی معقول اور صحیح فلسفہ جو لازماً اسلامی فلسفہ ہوگا' پیدا کر سکتے ہیں یا نہیں اور تعلیم کا ایسا فلسفہ انسان اور کائنات کی صحیح علمی اور عقلی توجیہہ دوسرے لفظوں میں اسلام کی سائنسی اور حکمیاتی توجیہہ کے ایک جزو کے طور پر ہی وجود میں آ سکتا ہے' ورنہ وجود میں نہیں آ سکتا اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام کی یہی سائنسی اور حکمیاتی توجیہہ ہے جو اسلامی نظام قوانین کی ایک ہی ممکن بنیاد بھی ہے۔ غرض ہم جس نقطۂ نظر سے بھی دیکھیں ہماری فوری ضرورت یہ نہیں کہ ہم اسلام کے قوانین کو بدل دیں' بلکہ یہ ہے کہ ہم اصلی اور صحیح قسم کی اسلامی تحقیق کے ذریعہ سے اسلام کی حکمیاتی اور سائنسی توجیہہ پیدا کر کے اسلام پر اپنے ایمان کو تازہ کریں اور اسلام کی صحیح علمی اور عقلی واقفیت سے اپنے آپ کو مسلح کریں' تاکہ محض عالم انسانی کا ایک جزو ہونے کی وجہ سے ہم جس نظریاتی جنگ میں مجبوراً شریک ہیں اس میں فتح پائیں اور شکست کھا کر مٹنے سے محفوظ رہیں۔ (ایضاً' صفحہ ۳۵)

مشاہدہ اور مطالعۂ قدرت کی قرآنی دعوت

قرآن نے مشاہدہ اور مطالعۂ قدرت پر کیوں زور دیا ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم کا نچوڑ یہ ہے کہ خدا کی محبت انسان کی فطرت میں رکھی گئی ہے اور جب تک انسان خدا کی ستائش' عبادت اور اطاعت کے ذریعہ سے خدا کی محبت کا اظہار نہ کرے اس کی شخصیت نشو ونما پا کر اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتی اور اس زندگی میں اور آنے والی زندگی میں ان مسرتوں اور راحتوں کو نہیں پا سکتی جو اس کے کمال کے ساتھ وابستہ ہیں۔ خدا کی محبت کے ذریعہ سے انسانی شخصیت کی تکمیل ہی مقصدِ کائنات ہے' لیکن خدا کی محبت جو انسان کی فطرت میں ہے' خدا کی معرفت کے بغیر بیدار نہیں ہوتی اور خدا کی معرفت حاصل کرنے کا طریق یہ ہے کہ انسان خدا کی صنعت یعنی کائنات کو دیکھے' اس

لیئے ہوئے خدا کا ذکر کریں وہاں ان سے اس بات کی بھی توقع رکھتا ہے کہ وہ کائنات کی تخلیق ﴿خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ پر غور کریں۔

خدا کی خالقیت وربوبیت کے نشانات کا کائنات کی تینوں سطحوں پر موجود ہونا

۱) قرآن کی رو سے خدا کی خالقیت اور ربوبیت کے نشانات کائنات کی تینوں سطحوں پر موجود ہیں۔ مادی دنیا کے مظاہر قدرت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے قرآن حکیم چاند' سورج اور ستاروں کی حرکت کا' برق وسحاب کا' ہواؤں کے چلنے کا' اختلافِ لیل ونہار کا' مینہ برسنے کا' چاند کے گھٹنے بڑھنے کا' پہاڑوں کا' زمین کی ہموار سطح کا' پہلے آسمان اور زمین کے یکجا ہونے اور پھر الگ الگ ہونے کا اور اس طرح کے اور مظاہر قدرت کا ذکر کر کے ان کے مشاہدہ اور مطالعہ کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اگر ہم ان مظاہر قدرت کے مشاہدہ اور مطالعہ کا حق ادا کر کے ان کی حقیقت اور اصلیت کو پوری طرح سمجھ لیں اور ان کے تمام رموز واسرار سے اور خدا کی ان تمام حکمتوں سے جو ان کے اندر پوشیدہ ہیں' پوری طرح آگاہ ہو جائیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام طبیعیاتی علوم (Physical Sciences) وجود میں آ جائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام سائنسی حقائق ایک سلسلہ یا نظام بناتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ علمی وعقلی ربط و ضبط رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف دلالت اور راہنمائی کرتے ہیں۔

۲) اسی طرح سے حیاتیاتی دنیا کے مظاہر قدرت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے قرآنِ حکیم زمین سے روئیدگی کے نمودار ہونے کا' لہلہاتی کھیتیوں کا' غلہ پیدا کرنے کا' مختلف رنگوں اور ذائقوں کے پھلوں کا' پانی سے ہر جاندار کے زندہ ہونے کا' مٹی سے انسان کی تخلیق کے آغاز کا' زمین سے نسل انسانی کے اگنے کا' زمین میں ہر قسم کے جانداروں کے پھیل جانے کا' پرندوں کے اڑنے کا' سواری کے کام آنے والے اور دودھ دینے والے چوپایوں کا' نباتات اور حیوانات کے ازواج کا' اونٹ کی حیرت انگیز جسمانی ساخت کا' انسان کی قوتِ فہم ودید وشنید کا اور ماں کے رحم میں انسانی جنین

کی حالتوں کے تدریجی تغیر کا اور اسی طرح کے دوسرے مظاہر قدرت کا ذکر کر کے ان کے مشاہدہ اور مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ہم ان مظاہر قدرت کا پورا مشاہدہ اور مطالعہ کریں' یہاں تک کہ ان کے تمام اسرار و رموز سے آشنا ہو جائیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام حیاتیاتی علوم (Biological Sciences) مکمل طور پر وجود میں آ جائیں گے۔

۳) پھر اسی طرح سے نفسیاتی یا انسانی دنیا کے مظاہر قدرت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے قرآنِ حکیم انسانی تاریخ کے بعض اہم واقعات اور قوانین کا اور انسانی فطرت کے بعض بنیادی قواعد اور حقائق کا ذکر کرتا ہے' مثلاً قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ کس طرح سے تاریخِ عالم میں پے در پے ایسے انسانوں کا ظہور ہوتا رہا جنہوں نے کہا کہ وہ خدا کے رسول ہیں اور لوگوں کو یہ بتانے آئے ہیں کہ ان کا سچا معبود خدا ہے جو اس کائنات کا خالق ہے' کس طرح سے رسولوں کی دعوت کو بعض لوگوں نے قبول کر لیا اور بعضوں نے قبول نہ کیا' کس طرح سے قبول کرنے والوں کے دل اطمینان اور مسرت سے بھر گئے' یہاں تک کہ وہ خدا کے لئے طرح طرح کی مصیبتیں اور ذلتیں اٹھانے بلکہ مرنے کے لئے تیار ہو گئے' کس طرح سے انکار کرنے والوں کو تباہی اور بربادی کا سامنا کرنا پڑا' یہاں تک کہ وہ نیست و نابود ہو گئے۔ کس طرح سے خدا کی محبت یا دین انسان کی فطرت میں ہے جو لازوال اور غیر مبدل ہے' کس طرح سے خدا کی عبادت انسان کے دل کو مطمئن کرتی ہے' کس طرح سے نوعِ انسانی اپنی فطرت کے اصلی تقاضوں کو بھولنے اور مختلف قسم کے غلط اور جھوٹے معبودوں کو اپنانے کی وجہ سے ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے اور کس طرح سے ان کے اتحاد کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ وہ اپنے سچے معبود کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں' کس طرح سے انسان کے دل میں نیک و بد' درست اور نادرست اور خوب و زشت کو پرکھنے کا ایک معیار موجود ہے' جو خواہ انسان اس سے گریز کے بہانے بناتا رہے' ہر وقت اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ پھر انسانی لاشعور کے بعض ایسے وظائف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جن کو ماہرین نفسیات نے حال ہی میں سمجھا ہے' قرآن حکیم ہمیں

بتاتا ہے کہ کس طرح سے انسانی فرد کے تمام چھوٹے اور بڑے اعمال اس کے وجود میں نامۂ اعمال کی صورت میں محفوظ رہتے ہیں اور کس طرح سے یہ نامۂ اعمال موت کے بعد انسان کے سامنے کھل جائے گا اور وہ کہے گا کہ میرا کوئی چھوٹا یا بڑا فعل ایسا نہیں جو اِس کے اندر لکھا نہ گیا ہو۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ اگر ہم ان حقائق کا پورا پورا تجزیہ کریں اور ان کے معانی اور مطالب اور ان کے نتائج و مضمرات اور اسباب و عوامل پر پوری طرح سے حاوی ہو جائیں تو تمام انسانی علوم (Human Sciences) اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ وجود میں آ جاتے ہیں۔ (ایضاً' صفحہ ۳۴۔۳۷)

☆ ☆ ☆

بقیہ: وحدتِ ادیان کا باطل تصور

جب تک حضرت مسیحؑ نہیں آئے' یہ دَور حضرت موسیٰؑ کا رہا' اس میں جو یہودی یعنی حضرت موسیٰؑ کے پیروکار تھے اگر ان کا اللہ اور آخرت پر ایمان تھا۔ اسی طرح حضرت مسیحؑ کے دور میں جو بھی اللہ پر' حضرت مسیحؑ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا تھا اور اس کا عمل درست تھا تو اس کے لئے کوئی خوف و حزن نہیں اور اللہ کے ہاں ان کا اجر محفوظ ہے۔ گویا انبیاء کرامؑ کے ساتھ صرف منسوب ہونا نجات کی ضمانت نہیں ہے بلکہ اپنے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ساتھ ساتھ اللہ اور آخرت پر ایمان' جس کے نتیجے میں عمل درست ہو جائے' لازم ہے۔ یعنی اصل بنائے نجات اللہ اور آخرت پر ایمان اور عمل صالح ہے' محض کسی گروہ' اُمت یا شخصیت کے ساتھ وابستگی نجات کی ضمانت نہیں۔

بارك الله لى ولكم فى القرآن العظيم ونفعنى وایاكم بالآیات والذكر الحكیم ٥٥

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا (۳)

تحریر: حامد سجاد طاہر☆

بیچ کی راہیں

علی گڑھ اور دیوبند دو انتہاؤں کا نام تھا۔ لہٰذا کئی ایسی تحاریک نے سر اٹھایا جنہوں نے اس Thesis اور Antithesis کے مابین synthesis کی راہ تلاش کی۔ اس مساعی میں یوں تو بہت سے افراد نے حصہ لیا لیکن یہاں ہم صرف ان افراد کا تذکرہ کریں گے جن کی تحاریک نے دار العلوموں کی شکل اختیار کی' یا پھر آخر میں ایک ایسے شخص کا تذکرہ کریں گے جس نے ایک ادارہ قائم کرنے کی کوشش کی۔

(۱) مولانا شبلی نعمانیؒ اور دار العلوم ندوہ

مولانا شبلی نعمانی پہلے علی گڑھ میں پڑھاتے تھے اور تب وہ ''پروفیسر شبلی'' کہلاتے تھے' مگر پھر آپ نے یہ محسوس کیا کہ علی گڑھ مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کا حق ادا نہیں کر سکتا' لہٰذا ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں منعقد ہونے والے ندوۃ العلماء میں آپ کی تجویز پر دار العلوم ندوۃ العلماء کے قیام کا فیصلہ کیا گیا تا کہ وہ افراد جو جدید علوم سے مزین ہوں وہ دینی علوم سے بالکل کورے نہ ہوں۔ تاہم اس ادارے میں باقاعدہ تدریس کا آغاز وسائل کی قلت کے باعث عملاً ۱۸۹۸ء میں ہوا۔ ارادہ تو یہی تھا کہ قدیم اسلامی نصاب جدید تقاضاؤں کے ساتھ پیش کیا جائے گا اور جدید علوم کو بھی شامل نصاب کیا جائے گا' لیکن عملاً کئی برس تک اس میں وہی پرانا نصاب پڑھایا جاتا رہا' یہاں تک کہ مولانا شبلی نعمانی بذاتِ خود حیدر آباد سے منتقل ہو کر یہاں آئے تو اصلاح کا کچھ عمل شروع ہوا۔ درسِ نظامی میں سے قدیم فلسفہ و منطق کو نکال کر فلسفۂ جدید کو شامل نصاب کیا گیا۔

☆متعلم قرآن کالج لاہور

انگریزی زبان کی تدریس کو بھی لازمی قرار دیا گیا۔ مزید برآں صرف ونحو کے مقابلے میں ادب وانشاء پر زیادہ زور دیا گیا۔ پرانے نصاب میں سے تفسیر' عقائد اور شریعت کو بھی مناسب جگہ دی گئی۔

ندوہ نے چند ایسے مصنفین کی ٹیم تو ضرور تیار کر دی جس نے تاریخ' سیرت' ادب اور صحافت میں قابل قدر کام کیا' ان میں سے سب سے زیادہ نمایاں سید سلیمان ندوی تھے' مگر پھر بھی اعلیٰ علمی سطح پر کوئی بہت گہرا اثر چھوڑنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ اس ضمن میں اگر کچھ کام ہوا بھی تو مولانا شبلی نعمانی کے غیر ندوی شاگردوں نے کیا' یعنی مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حمید الدین فراہی۔

(۲) مولانا ابوالکلام آزاد اور دارالارشاد

مولانا ابوالکلام آزاد کی اصل شہرت تو دراصل ایک داعی اور مفسر قرآن کی تھی۔ ہمارے ہاں بالعموم دعوت کا کام ایسا ہے جس کے لئے عموماً کسی تربیت کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ تاہم انہوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ قرآن کی دعوت کو اس دور میں عوامی ہی نہیں علمی سطح پر پیش کرنا بھی ضروری ہے' لہٰذا انہوں نے علی گڑھ اور دیوبند کی چپقلش سے تنگ آ کر اور ندوۃ العلماء کی مساعی سے مایوس ہو کر ۱۹۱۵ء کے لگ بھگ ایک نئے ادارے دارالارشاد کی بنیاد رکھی جس کا مقصد خود اُن کے الفاظ میں قوم میں بکثرت ایسے افراد تھوڑے وقت اور زیادہ علم وفکر سے پیدا کرنا تھا جو قرآن حکیم کی دعوت وتبلیغ کی خدمت اور اصلاح وارشادِ اُمت کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔ تاہم یہ ''اُڑنے بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار ہوئے ہم'' کے مصداق یہ ادارہ اپنے اوّلین ایام میں ہی اپنے بانی کی سیاست میں زیادہ دلچسپی کے باعث عملاً غیر مؤثر ہو کر رہ گیا۔

(۳) مولانا محمد علی جوہر اور جامعہ ملیہ

تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون کے دوران ہی بہت سے افراد نے یہ محسوس کیا کہ سرکاری گرانٹ ملنے کی وجہ سے علی گڑھ پر سرکار نوازی کے اثرات بہت زیادہ

غالب ہیں' چنانچہ انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کی اصلاح کے لئے کاوشیں شروع کیں' مگر اس میں ناکام ہونے کے بعد مولانا محمد علی جوہر نے ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ یونیورسٹی کی عمارت کے قریب ہی خیمے لگا کر جامعہ ملیہ کی ابتدا کی' جو مولانا جوہر کی ہمت اور جذبے کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ بعدازاں ۱۹۲۵ء میں اسے دہلی منتقل کر دیا گیا۔ مولانا نے اس ادارے کے تعارفی کتابچے میں یہ لکھا کہ ہمارا مطمح نظر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ اپنی درس گاہوں میں ایسے نوجوان پیدا کریں جو زمانے کے معیار کے مطابق تعلیم یافتہ و تربیت یافتہ شمار کئے جانے کے قابل ہوں۔ نیز وہ صحیح معنوں میں مسلمان بھی ہوں' جن میں اسلام کی روح ہو اور جو اپنے مذہب سے مکمل طور پر آگاہ بھی ہوں۔ اس ادارے میں سرکاری ملازمت سے بے نیاز کرنے کے لئے صنعت و حرفت اور دستکاری کی تعلیم کو بھی لازم کیا گیا تھا' ساتھ ہی دینی تعلیم کو بھی نمایاں جگہ دی گئی تھی۔ تاہم یہ بھی کوئی خاص کام سرانجام نہ دے سکا۔ مزید برآں حکومت کے عدم تعاون اور وسائل کی قلت کے باعث بھی یہ تحریک وسیع اثرات کی حامل نہ ہو سکی اور پھر وطنی قومیت کی حمایت اور دوقومی نظریئے کی مخالفت کے باعث مسلمانوں میں اسے قبولِ عام بھی حاصل نہ ہو سکا۔

(۳) علامہ اقبال اور دارالسلام

یہ وہی دَور تھا کہ جس میں علامہ اقبال جیسی ہمہ جہت اور ہمہ پہلو شخصیت ابھری جس نے علی گڑھ کی تقلید مغرب اور دیوبند کے جمود دونوں کو ہی نشانۂ تنقید بنایا اور ان کے مابین ربط کا مشورہ دیا۔ انہوں نے جدید مغربی نظامِ تعلیم کے فارغ التحصیل انسان کے متعلق یہ کہا:

> ''اسے محسوس یعنی اس قسم کی فکر کی عادت ہوگئی ہے جس کا تعلق اشیاء و حوادث کی دنیا سے ہے' لہٰذا اب ہمیں انہیں پھر اسلام کی طرف راغب کرنے کے لئے اور فکر اسلام کی تشکیل نو کے لئے کسی ایسے منہاج کی ضرورت ہوگی جو نفسیاتی اعتبار سے اس ذہن کے قریب تر ہو جو گویا محسوس کا خوگر ہو چکا ہے''۔

خود اقبال نے اسی منہاج کو یعنی مخاطب کی نفسیات کو پیش نظر رکھنے کو اپنی شاعری

میں بھی روا رکھا اور خطبات میں بھی۔ شاعری میں اسلام کے قصیدے پہلے بھی بہت گائے گئے تھے۔ حالی اور اکبر نے بھی گل و بلبل، عاشق و معشوق اور شمع و پروانہ کی روایتی شاعری کو چھوڑ کر قومی شاعری کی تھی مگر اس کی وجہ سے حالی کا کلام بہت سادہ اور پھیکا ہو گیا تھا جبکہ اکبر کو اپنی شاعری میں شوخی و ظرافت سے کام لینا پڑا۔ لہٰذا انہیں بھی کوئی زیادہ کامیابی نصیب نہ ہو سکی، لیکن اقبال کی خاصیت یہ ہے کہ آپ نے شاعری کی انہی اصطلاحات و تلمیحات سے کام لیا جو اس زمانے میں مروّج تھیں اور اس طرح کلام میں نفسیات کو پیش نظر رکھا۔ آپ نے فارسی میں شاعری بھی کی جو اُس وقت کی اعلیٰ شعری زبان مانی جاتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اردو میں بھی شعر کہے جو اُس وقت کی نسبتاً عوامی زبان سمجھی جاتی تھی۔ اور پھر آپ نے خطبات میں ایک طرف تو مخاطبین کے دین کو پیش نظر رکھتے ہوئے انگریزی زبان کو ذریعہ بنایا اور پھر ان ہی اصطلاحات اور طرزِ استدلال کو اپنا کر اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی۔ دراصل دیئے گئے اقتباس میں آپ نے اپنے خطبات کا منہاج ہی وضع کرنے کی کاوش کی ہے۔

آپ نے نقل اور عقل کے مابین ایک پل تعمیر کرنے کو اسلام کا موجودہ دَور میں اصل چیلنج قرار دیا۔ اس کے لئے آپ نے علی گڑھ اور دیوبند کی خصوصیات کو اکٹھا کرنے کا مشورہ دیا۔ آپ نے علی گڑھ کی سائنس کے ذریعے آیاتِ آفاقیہ کے مطالعے کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا۔

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

لیکن ساتھ ہی یہ بھی جتلا دیا کہ۔

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں!

اور پھر اُن کی مغرب کی اندھی تقلید کو بھی موردِ لعن و طعن ٹھہرایا۔

اُس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک
ہے جس کے تصور میں فقط بزمِ شبانہ!

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ!

اسی طرح آپ نے دیوبند کے ایک خاص طبقے کے ایمان کو بچا لینے کی کاوشوں کی تعریف کی ۔

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحرگاہی سے جو ظالم وضو!

اور شیطان کی زبان سے یہ الفاظ بھی کہلوا دیئے ۔

ہے اگر کوئی خطر مجھ کو تو اِس اُمت سے ہے!
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو!

تاہم ان کی جدید سائنس اور فلسفے سے بیزاری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

آئینِ نو سے ڈرنا ' طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں!

یہی وجہ ہے کہ آپ نے علی گڑھ اور دیوبند کی چپقلش پر اور ان کی کمیوں کو ایک خطبے میں یوں جمع کیا۔

کہا اقبال نے شیخ حرم سے
تہہ محرابِ مسجد سو گیا کون؟
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بُتکدے میں کھو گیا کون؟

آپ نے علم کو جدید اور قدیم جیسی اصطلاحات سے مقید کرنے کو غلط قرار دیا اور اس قصہ کو ختم کرتے ہوئے یہ کہا ع

دلیل کم نظری ' قصۂ قدیم و جدید!

اور پھر اس ساری بحث کا نتیجہ یہ نکالا ۔

وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم!

آپ نے دورِ حاضر کے انسان کی سب سے بڑی غلطی یہ قرار دی کہ وہ اپنی ع
عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا!

لہٰذا وہ ۔

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا!

اور پھر ہر معاملے میں عقل کے دخل پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے
بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے

اور اس کے مقام کو واضح کرنے کے لئے کہا۔

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے؟ چراغِ رہ گزر ہے!
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہ گزر کو کیا خبر ہے!

لہٰذا آپ نے مشورہ دیا ۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے ' منزل نہیں ہے!

کیونکہ ۔

عقل گو آستاں سے دُور نہیں
اس کی قسمت میں پر حضور نہیں!

چنانچہ عقل کا استعمال جائز ہے مگر پھر اسی پر قناعت کرنا گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔

بہتر ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے!

چنانچہ ع

جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول!

مزید برآں آپ نے صرف دُنیوی مفاد یا مادی اشیاء کی جانب توجہ دینے کے متعلق فرمایا ۔

نہیں ہے غیر از نمود کچھ بھی جو مدعا تیری زندگی کا
تو اک نفس میں جہاں سے مٹنا تجھے مثالِ شرار ہوگا

انہی خیالات کو لے کر تجلیاتِ کلیم اور مشاہداتِ حکیم کو یکجا کرنے کے لئے آپ نے دارالسلام کے قیام کا قصد فرمایا۔ لہٰذا اس کام کے لئے ایک ٹرسٹ کا قیام عمل میں لایا گیا اور ضلع گورداسپور میں پٹھانکوٹ کے گاؤں میں چند عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ تاہم اس مرحلے پر پہنچ کر آپ نے جب ہندوستان میں اردگرد نظر دوڑائی تو انہیں کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا جو اس ادارے میں بطورِ استاد تعینات کیا جا سکے۔ لہٰذا آپ نے جامعہ الازہر (مصر) کے اس وقت کے شیخ علامہ مصطفیٰ المراغی کو ایک خط لکھا جس میں اس ادارے کے قیام کا مقصد واضح کیا اور ساتھ ہی اس کے لئے ان سے ایک معلم کی درخواست بھی کی۔ اس خط کا ایک حصہ باوجود طوالت کے یہاں نقل کرنا مفید ہوگا:

''ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے ایک گاؤں میں ایک ایسا ادارہ قائم کریں جس کی نظیر آج تک یہاں وقوع میں نہیں آئی۔ ہماری خواہش ہے کہ اس ادارہ کو وہ شان حاصل ہو جو دوسرے دینی اور اسلامی اداروں کی شان سے بہت بڑھ چڑھ کے ہو۔ ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علومِ جدیدہ کے چند فارغ التحصیل حضرات اور چند علومِ دینیہ کے ماہرین کو یہاں جمع کریں۔ یہ ایسے حضرات ہوں جن میں اعلیٰ درجہ کی ذہنی صلاحیتیں موجود ہوں اور وہ اپنی زندگیاں دین اسلام کی خدمت کے لئے وقف کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ہم ان کے لئے تہذیب حاضرہ کے شور وشغب سے دُور ایک کونے میں ہوسٹل بنانا چاہتے ہیں جو کہ ان کے لئے ایک علمی اسلامی مرکز ہو اور ہم ان کے لئے ایک لائبریری قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہر قسم کی نئی اور پرانی کتاب موجود ہو۔ اور ان کی رہنمائی کے لئے ہم ایک ایسا معلم جو کامل اور صالح ہو اور قرآن حکیم میں بصیرتِ تامہ رکھتا ہو' نیز انقلابِ دورِ حاضرہ سے بھی واقف ہو' مقرر کرنا چاہتے ہیں' تاکہ وہ ان کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی روح سے واقف

کرے اور تفکر اسلامی کی تجدید یعنی فلسفہ، حکمت، اقتصادیات اور سیاسیات کے علوم میں ان کی مدد کرے، تاکہ وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعے تمدنِ اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے کے لئے جہاد کر سکیں''۔

علامہ نے ممکنہ استاد کی مزید خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ:

''چاہئے کہ یہ شخص علومِ شرعیہ اور تاریخ تمدنِ اسلامی میں ماہر ہو، نیز انگریزی زبان پر بھی قدرتِ کامل رکھتا ہو''۔

اور پھر آپ نے اسلام کی عام تبلیغ سے اس کام کو اعلیٰ اور ارفع گردانا اور جامعۃ الازہر کی اُس وقت کی ہندوستان میں مبلغین بھیجنے کی سکیم کی مخالفت کی:

''میں آپ سے یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ ایک مرکز اسلامی کی بنا، جیسا کہ میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے، مقصدِ تبلیغ کے لئے مختلف مقامات پر مختلف مبلغین بھیجنے سے زیادہ اولیٰ و اقرب ہے۔ مجھے توقع ہے کہ دینِ حق کا نور اس مرکز سے ہندوستان کے تمام اطراف و اکناف میں پھیلے گا''۔

لیکن افسوس صد افسوس کہ وہاں سے بھی یہ جواب آ گیا کہ ہمارے پاس مطلوبہ معیار کا کوئی شخص موجود نہیں، لہٰذا ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ'' کے مصداق منصوبہ یہیں ختم ہو گیا اور پیشِ نظر کام کے لئے کوئی عملی پیش رفت نہ ہو سکی۔ پھر انہی دنوں آپ قرآن کے طالب علموں کی رہنمائی کے لئے کچھ نوٹس لکھنے پر غور و فکر کر رہے تھے اور نواب بھوپال نے بھی اگرچہ وظیفہ تو غیر مشروط طور پر ہی دیا تھا مگر ساتھ ہی اس کی خواہش بھی ظاہر کی تھی، لیکن کچھ طوالت عمر اور ناسازیٔ طبع اور کچھ نظر کی کمزوری کے باعث وہ اس کام کو اکیلے سرانجام دینے کی ہمت اپنے اندر نہ پاتے تھے۔ لہٰذا آپ نے ایک ابھرتے ہوئے نوجوان عالم سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو اس کام میں اپنی معاونت کے لئے بلایا، مگر انہوں نے جواب دیا کہ آج کل میں نسبتاً زیادہ اہم کام میں مصروف ہوں، لہٰذا یہ بیل بھی منڈھے نہ چڑھ سکی۔ تاہم مولانا مودودی دارالسلام آئے اور اپنے ساتھیوں سمیت یہیں کام کیا اور یہیں جماعت اسلامی کا اوّلین دفتر بنا اور شاید تفہیم القرآن بھی آپ نے بعد میں علامہ کی خواہش کے مطابق ہی لکھی ہو۔

علامہ کا ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو میں یہاں ان کے بعض منفی پہلوؤں کا تذکرہ بھی کرنا چاہوں گا جن کی بدولت آج ان کے نام لیواؤں کی عظیم اکثریت سیکولر مزاج کی حامل ہے۔ یہ بات درست ہے کہ آپ نے قرآن کے ساتھ جو تعلق استوار کیا وہ بہت کم کے حصے میں آیا ہوگا' تاہم یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ انہوں نے قرآن کی اصل شارح یعنی احادیث نبویؐ کی جانب بہت کم توجہ دی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خطبات میں بھی اور شعر و شاعری میں بھی جگہ جگہ ضعیف اور موضوع روایات سے استدلال کیا ہے۔ دوسری طرف کئی صحیح احادیث کو رد کر دیا ہے' مثلاً نزولِ عیسیٰ اور ظہورِ مہدی کے مسائل کو انہوں نے عجمی فکر کا شاخسانہ قرار دیا اور پھر انہوں نے خطابات میں شریعت و قانون اور اجماع و اجتہاد کے تحت جو باتیں کی ہیں وہ بڑی حد تک متنازع بلکہ قابل تنقید ہیں۔

چند دیگر کاوشیں

یورپ میں ملوکیت کی جگہ جمہوریت نے لے لی اور مختلف علومِ عمرانی پر غور و فکر کا کام شروع ہوا اور اس ضمن میں مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں۔ جمہوریت اور سرمایہ داری (کیپٹل ازم) جیسے نظام ابھرے۔ جب یورپی اقوام نے اپنا تسلط عالمِ اسلام پر جما لیا تو انہوں نے ان نظاموں کو یہاں بھی رائج کرنے کی کوشش کی۔ اس سے مسلمانوں کو بھی کچھ ہوش آیا اور انہوں نے بھی اسلام پر بطور ایک نظامِ حیات غور کرنا شروع کیا۔ نتیجتاً پورے عالمِ اسلام میں مختلف تحاریک اٹھ کھڑی ہوئیں جن سب کے پیچھے اسلام کو بطور ایک نظام غالب کرنے کا فلسفہ نظر آتا ہے۔ ان تحاریک کا یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ عوام الناس کے اندر مغرب سے مرعوبیت کچھ کم ہوئی اور اسلام پر کچھ اعتماد بحال ہوا' تاہم اگر ہم بنظرِ غائر ان تحاریک کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحاریک خود بھی بڑی حد تک مغربی فکر سے متاثر نظر آتی ہیں۔ ان کے نزدیک دین کا مطلب ہی ایک نظامِ حیات بن کر رہ گیا ہے جس پر الٰہیات کا پردہ ڈالا گیا ہے۔ یہ مراسمِ عبودیت پر زور تو ضرور دیتی ہیں مگر ان کے کارکنوں میں ایمان نام کی کوئی شے نظر نہیں آتی۔ ویسے تو یہ دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت کا بھی دم بھرتی نظر آتی ہیں لیکن ان کی

تمام تر مساعی صرف اور صرف دُنیوی کامیابی کے پیچھے گھوم رہی ہے' یہاں تک کہ ان کا ماٹو یہی شعر بن کر رہ گیا ہے۔

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلماں میں اسی لئے نمازی!

(واضح رہے کہ یہ شعر نعیم صدیقی مرحوم کا ہے۔)

چنانچہ جب زندگی کا مقصد صرف دین کی سرفرازی ہی بن جائے تو پھر علمی کاوشوں کی جگہ سیاسی کام زیادہ اہمیت کے حامل قرار پاتے ہیں اور مسند امارت پر جگہ انہی کو ملتی ہے جو جوشیلی اور جذباتی تقریریں کر سکتے ہوں۔ ذمہ داریوں اور عہدوں کے حق دار اہل علم اشخاص کی جگہ کارکن ٹائپ کے افراد بن جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اُمت کی ایک معتد بہ تعداد کے ایمان کی تجدید کے بغیر اسلامی انقلاب کے خواب دیکھنا جنت الحمقاء میں رہنے کے مترادف ہے۔ ان تحریکوں کی ناکامی کا مادی سبب نجانے کیا بیان کیا جائے تاہم اصل وجہ یہی ہے کہ یہ ایمان اور قرآن کی شمشیر کو ہاتھ میں لئے بغیر میدانِ کارزار میں اتر آئے ہیں۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں!

چنانچہ ان تحریکوں کا آغاز خواہ کتنے ہی اخلاص سے کیوں نہ ہوا ہو لیکن بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ اب تحاریک کی اصل حیثیت مذہبی سے زیادہ سیاسی اور دینی سے زیادہ دُنیوی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دوسرے سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلسٹ نظام کو ترجیح دیتے ہیں اور اِن کو سود سے پاک اسلامی نظام میں انسانیت کی فلاح نظر آتی ہے' اسی لئے سود سے پاک معیشت کے متعلق ان تمام سیمینارز میں یہی بات زیر بحث آتی ہے کہ کس طرح اس نظام کو اپنا کر ایک بینکار زیادہ سے زیادہ نفع کما سکتا ہے۔ دوسرے جمہوریت پر جان دیتے ہیں' یہ اسلامی انقلاب کی خاطر نعرے لگاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے

(باقی صفحہ 34 پر)

تعارف وتبصرۂ کتب

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : رَدِّ قادیانیت کے زریں اصول

مصنف : مولانا منظور احمد چنیوٹی

ضخامت : 440 صفحات

قیمت : 150 روپے

ملنے کا پتہ : (i) چنیوٹی کتب خانہ' محلّہ گڑھا' چنیوٹ

(ii) مکتبہ سید احمد شہید' اردو بازار' لاہور

کتاب کے مصنف مولانا منظور احمد چنیوٹی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ تحفظ ختم نبوت کے حوالہ سے اُن کا نام امتیازی شہرت رکھتا ہے۔ وہ ایک ممتاز عالم دین ہیں اور تحفظ ختم نبوت ان کا خصوصی موضوع ہے۔ اس حوالے سے وہ بین الاقوامی طور پر متعارف ہیں۔ اس موضوع پر وہ تیس سے زیادہ کتابیں لکھ چکے ہیں جن میں اردو کے علاوہ بعض عربی میں اور کچھ انگریزی میں ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں ایک خاص ضمنی عنوان کو لے کر اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے اور قادیانیوں کے عقائد کی نہ صرف قلعی کھولی گئی ہے بلکہ مسکت جواب دیئے گئے ہیں۔ خاص طور پر اس فرقہ کے بانی کی غلط ثابت ہونے والی پیشینگوئیاں' کذب بیانیاں اور فحش گوئی بڑی تفصیل کے ساتھ مع حوالہ جات درج کی گئی ہے۔

مسلمانوں کا یہ متفقہ عقیدہ ہے جس میں کسی مکتب فکر کو قطعاً کوئی اختلاف نہیں کہ

وزراء ڈاکٹر محمود احمد غازی اور راجہ محمد ظفر الحق بھی شامل ہیں۔

کتاب ردقادیانیت پر حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر مسلمان کے لئے اس کا مطالعہ قادیانی دجل وفریب سے محفوظ رکھے گا۔ کتاب مضبوط جلد میں محفوظ کی گئی ہے اور ٹائٹل حسب عنوان تیار کیا گیا ہے۔

(۲)

نام کتاب : سوزِ دروں

مصنفہ : حمیرا عبید الرحمٰن

ضخامت : 148 صفحات

قیمت : 66 روپے

ملنے کا پتہ : (۱) ڈبائی منزل 'A-577' بلاک J' نارتھ ناظم آباد' کراچی

(۲) مکتبہ نور اسلام' رحمٰن مارکیٹ' غزنی سٹریٹ' اردو بازار' لاہور

سوزِ دروں اصلاحی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ مصنفہ دردمند دل اور حساس جذبات رکھتی ہیں۔ اپنے اردگرد کے حالات سے گہرا تاثر لیتی ہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں تحریر کا سلیقہ عطا کیا ہے اس لئے اُس کا شکر ادا کرنے کے لئے اپنی صلاحیتوں کو صراطِ مستقیم کی طرف چلنے کی دعوت دینے میں استعمال کرتی ہیں۔ اس کتاب میں دیئے گئے چھوٹے چھوٹے افسانے اسی جذبے کا مظہر ہیں۔

وعظ ونصیحت کا سلیقہ خود ایک بڑا نازک فن ہے' کیونکہ شائستگی کے ساتھ دی گئی نصیحت تو پُر تاثیر ہوتی ہے جبکہ وہی نصیحت اگر بھونڈے انداز میں کی جائے تو نہ صرف بے اثر رہے گی بلکہ نفرت کے جذبات ابھارے گی۔ مصنفہ میں تحریر کی شائستگی کا وافر ملکہ موجود ہے جو اِن پُر تاثیر افسانوں سے ظاہر ہے۔

اس مجموعے میں شامل ہر افسانہ ایک مختصر سی تحریر ہے جسے پڑھتے وقت صاف محسوس ہوتا ہے کہ مصنفہ ماحول کو عبرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور صورتِ حال کی

اصلاح کے لئے ہمہ وقت اپنے قلم کو تیار پاتی ہے۔ ان افسانچوں کی زبان سادہ اور انداز پُر تاثیر ہے جس نے ان ہلکی پھلکی تحریروں کو قوتِ نفوذ سے مالا مال کر دیا ہے۔

کتاب کا ابتدائیہ معروف وممتاز عالم دین ڈاکٹر اسرار احمد نے تحریر فرمایا ہے جس کے بعد کتاب کی افادیت پر مزید کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ہلکے پھلکے مختصر اور سبق آموز افسانوں کا یہ مجموعہ نوجوانوں کے لئے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ مصنفہ کے لئے یہ صدقہ جاریہ ہے کہ بہت سے لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور اپنے فکر و نظر میں گہرا تاثر محسوس کریں گے۔

(۳)

نام کتاب : جب پنجاب اسمبلی نے ربوہ کا نام چناب نگر رکھا

مصنف : مولانا منظور احمد چنیوٹی

ضخامت : 210 صفحات

قیمت : 90 روپے

ملنے کا پتہ : مکتبہ سید احمد شہید' اردو بازار' لاہور

مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کر کے جھوٹے نبیوں کی فہرست میں ایک نام کا اضافہ کیا۔ مرزائی تحریک کا مرکزی مقام ضلع گورداسپور کا ایک قصبہ قادیان تھا۔ اسی مناسبت سے مرزا کے ہم عقیدہ لوگوں کو قادیانی کہا جاتا ہے۔ تقسیم ہند کے وقت یہ قصبہ پاکستان میں شامل نہ ہوا تو مرزا غلام احمد کے بیٹے اور اس کے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود نے اپنی جماعت کو قادیان سے لاہور منتقل ہونے کا حکم دیا' چنانچہ وہ سب لوگ لاہور آ گئے۔ بعد ازاں انہوں نے سوچی سمجھی سکیم کے تحت ضلع جھنگ میں ایک بستی آباد کی جس کا نام ربوہ رکھا۔ یہ شہر قادیانیوں کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔

علمائے حق میں سے بعض نے اس فتنے کو بھانپ لیا اور اس کے تعاقب میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ ان علماء میں سرفہرست مولانا منظور احمد چنیوٹی کا نام ہے۔ انہوں نے

ردّ قادیانیت میں متعدد کتابیں لکھیں اور قادیانیوں کے عقائد کا پردہ چاک کر کے ان کے مذموم عزائم سے مسلمانوں کو خبردار کیا۔ ۲۱ سال کی عمر میں ہی جب مولانا منظور احمد چنیوٹی نے تدریس شروع کی تو ساتھ ہی قادیانیت کے باطل عقائد کے رد میں تقریروں اور تحریروں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ تحریک ختم نبوت میں اس قدر سرگرم ہوئے کہ بیسیوں دفعہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ بلدیہ چنیوٹ کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ بعدازاں تین مرتبہ صوبائی اسمبلی کے رکن بنے مگر ان کا مشن وہی رہا۔ وہ اپنی ہر حیثیت سے ردّ قادیانیت پر کام کرتے رہے یہاں تک کہ مرزائیوں کو ان کے باطل عقائد کی وجہ سے غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا۔ اس ساری جدوجہد کے دوران مولانا چنیوٹی نے قادیانیوں کے دجل وفریب کو پوری دنیائے اسلام کے سامنے طشت از بام کیا اور اس سلسلہ میں چالیس سے زیادہ اسلامی ملکوں کے دورے کئے۔

بعدازاں انہوں نے قادیانی مرکز ربوہ شہر کا نام تبدیل کرنے کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ کئی نام تجویز ہوئے اور نواں قادیان کے نام کا تو نوٹیفکیشن بھی جاری ہو گیا تھا مگر پھر اس کو نامناسب جان کر کسی دوسرے نام کے لئے کوشش شروع ہوئی۔ چنانچہ ۴ فروری ۱۹۹۹ء کو نیا نوٹیفکیشن جاری ہوا جس میں ربوہ کا نام چناب نگر رکھ دیا گیا۔

زیر تبصرہ کتاب میں ربوہ شہر کے نام کی اس تبدیلی کی ساری کارروائی جس میں مولانا منظور احمد چنیوٹی کی شبانہ روز جاں گسل جدوجہد شامل ہے' بڑے مربوط انداز میں بیان کی گئی ہے۔ اس کارروائی کے ضمن میں اخبارات میں خبریں شائع ہوتی رہیں۔ ان اخبارات کے متعلقہ حصوں کی فوٹو کاپیاں کتاب کے ایک باب میں جمع کر دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ اس سلسلہ میں جاری ہونے والے نوٹیفکیشن بھی کتاب میں موجود ہیں۔ یوں یہ کتاب اپنے عنوان پر ایک مکمل تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

کتاب میں تمام متعلقہ ریکارڈ بڑی محنت کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے۔ کتاب مضبوط جلد میں محفوظ اور حسب حال ٹائٹل سے مزین ہے۔

☆ ☆ ☆

ماہنامہ القاسم کی آئندہ خصوصی اشاعت

حضرت مولانا
سید سلیمان ندویؒ نمبر

علامہ ندویؒ کی علمی وعملی پُرعزم زندگی، لازوال جدوجہد، قابلِ فخر کارناموں، لائق صد تحسین علمی اور تاریخی کامیابیوں پر مشتمل، گویا ایک کاروانِ علم وعمل کی ترجمان دستاویز تیاری کے مراحل کا آغازِ کار، حتمی تاریخ اشاعت کا اعلان بعد میں کیا جائے گا

ملی وقومی خدمات کے تذکرے، فروغِ علم اور حفاظت اسلام کے لئے ان تھک جدوجہد کی تاریخ، نورِ علم سے معمور تحریروں کا تجزیہ، اہم دینی وسیاسی اور علمی اور تاریخی کامیابیوں کی روئیداد، صحافیانہ خدمات کا جائزہ، ادبی شہ پاروں اور لازوال تحریروں کا انتخاب، تصورِ وحدتِ اُمت کی آبیاری اور تصنیفات وتالیفات کا تعارف، آپ کی نگارشات بھی خصوصی اشاعت کے صفحات کی زینت بن سکتی ہیں ..... ضخامت : 500 سے زائد صفحات قیمت 300 روپے، القاسم کے مستقل خریدار صرف 100 روپے یا اسی مالیت کے ڈاک ٹکٹ بھیج دیں۔ نئے خریدار 250 روپے یا اسی مالیت کے ڈاک ٹکٹ بھیج دیں تو خصوصی اشاعت اُن کو رجسٹرڈ ڈاک سے بھیج دی جائے گی۔

☆☆☆☆

القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ

برانچ پوسٹ آفس خالق آباد، نوشہرہ، سرحد، پاکستان

تھا۔ سوچا ملازمت والے معاملے کا تعاقب نہ کیا جائے' اور جو پہلے آ جائے اسے ہی مقدر سمجھا جائے۔ رجوع الی القرآن کورس کے لئے درخواست دی۔ انٹرویو ہوا اور ۲ ستمبر ۲۰۰۲ء سے باقاعدہ کلاسز کا اجرا ہو گیا۔ باقی خیالات دل سے خود بخود رخصت ہو گئے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ساتھ افتتاحی نشست آج تک خوب یاد ہے۔ ساتھیوں سے تعارف تو ہوا ہی۔ خدمتِ قرآن کی ۳۵ سالہ جہدِ مسلسل' ہمہ جہت مومنانہ طرزِ فکر و عمل اور اس کے نتیجے میں وقوع پذیر ہونے والے اداروں سے آگاہی ہوئی۔ قرآن اکیڈمی کے قیام اور رجوع الی القرآن کورس کے اغراض و مقاصد پر سیر حاصل تبصرہ سنا۔

پہلے ہی دن سے اس کورس کا سورج نصف النہار پر تھا جو مسلسل نو ماہ اسی جگہ پوری تابانی سے چمکتا رہا۔ عاشقوں کی ایک جماعت ہر قسم کی ذاتی مشغولیات سے بے نیاز اس کام میں جُت گئی۔ ان سب کا جوشِ رفتار ایک ہی سمت میں تھا۔ سب کا نصب العین ایک ہی تھا۔ قرآن فہمی اور حصولِ فوز و فلاح' عربی گرامر' عربی بول چال' تجوید' حدیث و فقہ' تذکیر بالقرآن اور منتخب نصاب یعنی سورۃ العصر سے حصولِ فوز و فلاح کے ترکیبی عناصر ایمان' عمل صالح' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے عمومی معیار' برتر طرق اور بلند ترین مقامات کی نشاندہی' تصرف اور تفسیر کی عملی مثالیں' انجام و انعامات وغیرہ سے کماحقہ واقفیت۔ اس مرکزی دھارے کے پہلو بہ پہلو اقبالیات' اسلام کی نشاۃ ثانیہ' مادی اور روحانی فلاسفہ کا تقابلی جائزہ' ماہرین و اکابرین کے معاشی' معاشرتی مسائل' فلسفہ اخلاق اور ایمانیات پر خصوصی لیکچرز اور دعوت رجوع الی القرآن کے پس منظر میں ڈاکٹر صاحب کی ویڈیوز ایسی مزید دلچسپیاں تھیں گویا کورس کے زیور پر خوبصورت اور قیمتی ہیرے موتی۔

ابریشم کی طرح نرم ان عاشقوں کی جماعت اتنی لگن سے محو تھی کہ ہر لمحہ ہر آن ان کے پیشِ نظر ان کا مقصد ہی رہتا تھا۔ پس یہی لگن تھی کہ معیاری بات بتائی اور سمجھائی جائے۔ پھر شرکاء کو امتحانات کی کٹھالیوں سے ہر وقت گزارا جائے تاکہ جو سنا ہے' وہ سمجھا جائے اور جو سمجھا ہے اسے اچھی طرح راسخ کیا جائے۔ میں نے اپنے تئیں بارہا سوچا کہ کوئی ایسا 'شارٹ کٹ'' تجویز کیا جائے جس سے یہ مقصد بھی حاصل ہو جائے اور اس توسیعی آزمائشوں سے بھی بچا جا سکے لیکن یقین جانئے ذہن کسی ایسی ترکیب کے وضع کرنے میں مکمل ناکام رہا۔

اس کورس میں اساتذہ اور شرکاء کا کردار مثالی تھا۔ یہ شاندار رابطے کی کاوش تھی جو دینی مدارس کی روایتی ادب و آداب سے کافی ہٹ کر تو ضرور تھی لیکن اس میں ادب آداب کے ضروری اثرات و ثمرات کی واضح جھلک خاصی نمایاں تھی۔ اس بندۂ ناچیز کو گورنمنٹ کالج اور انجینئرنگ یونیورسٹی میں تعلیم کے بعد دورانِ ملازمت نیپا' سٹاف کالج کے علاوہ اندرون و بیرون ملک بہت سے کورسز کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ آج تک میں نے جتنے کورسز کئے ہیں قرآن اکیڈمی میں رجوع الی القرآن کورس اپنی متانت' معنویت' مقصدیت' عملیت' غرضیکہ ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ پورے وثوق سے عرض کر رہا ہوں کہ میں نے آج تک اتنا Demanding کورس نہیں کیا جو صبح آٹھ بجے سے دوپہر ایک بجے تک کی تدریس کے بعد روزانہ کم از کم چار پانچ گھنٹے کے سنجیدہ اور گہرے مطالعے کا تقاضا کرتا ہو۔''